علی گڑھ سے علی گڑھ تک
اطہر پرویز
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
اشتراک
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

علی گڑھ سے علی گڑھ تک

علی گڑھ سے علی گڑھ تک

اطہر پرویز

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

Aligargh Se Aligargh Tak
by
Athar Parwez
Rs.99/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔110025 ☎ 011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۔110006 ☎ 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی ۔400003 ☎ 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۔202002 ☎ 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2012 تعداد: 1100 قیمت: -/99 روپے

ISBN :978-81-7587-789-4 سلسلۂ مطبوعات: 1602

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی ۔110025

فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099

ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، C-7/5، لارنس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی ۔110035

اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شان دار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ نامساعد حالات نے سمت و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلاشرکتِ غیرے شائع کی ہیں)۔ زیرِ نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابل فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اربابِ حل وعقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُر خلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اوّلین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جاچکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہو رہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود
منیجنگ ڈائرکٹر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

پیش لفظ

اطہر پرویز اردو کے ممتاز ادیب، نقاد اور محقق ہیں۔ ان کی کئی کتابیں اردو کے ادبی سرمائے میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ قوم نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف ان کی کتابوں پر بڑی تعداد میں انعامات کی صورت میں کیا ہے۔ شاید ہی اردو کا کوئی دوسرا ایسا ادیب ہو جسے اتنی بڑی تعداد میں انعامات سے نوازا گیا ہو۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ انھوں نے بچوں کے ادب پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ اسی لیے بچوں کے صفِ اول کے ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ دراصل انھیں اپنی قوم کے بچوں اور نوجوانوں کے مستقبل سے بہت دلچسپی ہے۔ اسی لیے انھوں نے چند سال قبل اپنے چند جوشیلے ساتھیوں کی مدد سے ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام پر علی گڑھ میں ایک اردو میڈیم اسکول قائم کیا تھا جس کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کا اعزاز مجھے بخشا گیا تھا۔

مجھے اور میری بیوی مرحومہ قدسیہ زیدی کو اطہر پرویز ہمیشہ سے عزیز رہے ہیں جس کی وجہ ان کی دلنواز شخصیت اور ہمدرد طبیعت ہے۔ پھر وہ کام کو نہ صرف فرض بلکہ خود پر قرض سمجھتے ہیں اور انتہائی پابندی، ایمانداری، خلوص، لگن اور محنت کے ساتھ اس قرض کی ادائیگی میں منہمک رہتے ہیں۔

"علی گڑھ سے علی گڑھ تک" اطہر پرویز کی تصانیف میں ایک مخصوص اور منفرد قسم کی کتاب ہے۔ اسے پڑھ کر مجھ پر دو باتوں کا اثر ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ علی گڑھ ان کے لیے "ہوالاول ہوالآخر" ہے۔ وطن سے ہزاروں میل دور وہ موریشیس میں اردو کے فروغ اور ترویج میں منہمک ہیں مگر علی گڑھ کی یاد انھیں

بے چین رکھتی ہے۔ دوسرے اس سے ان کی گہری انسان دوستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ آج کے صنعتی دور میں جب لوگوں کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ ان کے ہمسائے میں کون کون رہتا اور کس حال میں رہتا ہے، اطہر پرویز نے اپنے قریب رہنے والوں کی زندگی، حالات اور عادات کا گہرا اور ہمدردانہ مطالعہ کیا ہے۔

شمشاد مارکیٹ فرلانگ بھر لمبے ایک ایسے بازار کا نام ہے جو ہندستان کے ہر چھوٹے قصبے میں نظر آتا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف صاف ستھری، گندی میلی، بارونق اور اجڑی ہوئی، غرض ہر طرح کی دکانیں، اور ان دکانوں میں ضرورت کا ہر سامان۔ ایک اجنبی آدمی کے لیے ایسے بازار کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ لیکن جن لوگوں کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلق رہا ہے وہی جانتے ہیں کہ شمشاد مارکیٹ صرف مارکیٹ ہی نہیں کچھ اور بھی ہے۔ یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی اور شمشاد مارکیٹ میں کیا تعلق ہے۔ ان میں اصل محور کون ہے، یونیورسٹی یا شمشاد۔ اطہر پرویز صاحب کی یہ کتاب پڑھ کر تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اصل چیز شمشاد مارکیٹ ہے اور یونیورسٹی نے اس بازار کے سہارے جنم لیا ہے۔ میرا علی گڑھ سے قریبی رشتہ رہا ہے۔ میں نے عمر عزیز کے گیارہ سال وہاں گزارے ہیں۔ دکانداروں کی باوقار اور ایماندار شخصیتوں نے مجھے بھی متاثر کیا تھا۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ اطہر پرویز صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ زیب داستاں کے لیے مبالغہ آرائی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ انھوں نے واقعات میں کہیں نمک مرچ لگانے کا کام نہیں کیا ہے۔ شمشاد مارکیٹ کو نظر انداز کر کے ہم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کوئی مکمل تہذیبی، سماجی، سیاسی اور تعلیمی تاریخ مرتب نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جب سے اس بازار نے جنم لیا ہے یہ یونیورسٹی کے طالب علموں، ملازموں اور استادوں کی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ اطہر پرویز نے صحیح لکھا ہے کہ "علی گڑھ ان لڑکوں (طالب علموں) کا گھر اور شمشاد ان کا ڈرائنگ روم

کم ڈائیننگ رُوم ہے" یونیورسٹی کی ہر اہم تحریک اور انقلاب نے شمشاد کے چائے خانوں میں جنم لیا ہے۔ اس بازار کے سینے میں طالب علموں کی فتح و شکست، کامیابیوں اور ناکامیوں کی بے شمار داستانیں محفوظ ہیں۔ ان داستانوں کو سننے کے لیے کانوں کی نہیں دل و دماغ کی ضرورت ہے۔
شمشاد مارکیٹ کی یہ اہمیت اس کی دکانوں سے کہیں زیادہ اس کے مکینوں سے ہے۔ یہاں کے سیدھے سادے، نیک، شریف اور ایماندار دکاندار آج بھی انیسویں صدی کے جاگیردارانہ ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔
جب کبھی کسی نے علی گڑھ پر کچھ لکھا ہے تو کسی نہ کسی طرح شمشاد مارکیٹ کا ذکر اس میں آگیا ہے لیکن اس مارکیٹ کو ایک مستقل موضوع پہلی بار اطہر پرویز ہی نے بنایا ہے۔
عام طور سے شاعر، ادیب اور فلسفی اپنے گردوپیش کی دنیا سے بے خبر رہتے ہیں کیونکہ ان کی تخلیق کے سوتے تخیل اور وجدان سے پھوٹتے ہیں۔ میر تقی میر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھیں برسوں تک اپنے کمرے کی اس کھڑکی کے باہر کا علم نہیں ہوا جو باغیچے کی طرف کھلتی تھی۔ کیونکہ ان کا باغیچہ تو ان کی دل کی دنیا میں تھا۔ اطہر پرویز کا معاملہ دوسرا ہے۔ انھوں نے اپنے گھر کی اس کھڑکی کو ہمیشہ کھلا رکھا جس کا رخ شمشاد مارکیٹ کی طرف تھا۔ انھوں نے وہاں کے دکانداروں اور مکینوں کی زندگی میں گھل مل کر ان کی شخصیت عادات و اطوار اور کردار کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ اطہر پرویز کو شمشاد مارکیٹ کا ماحول اور اس کی تہذیبی اقدار اس لیے عزیز ہیں کہ وہاں ابھی بہت سے ولی محمد باقی ہیں۔ وہ ولی محمد جنھیں دکان اور روپے سے زیادہ اپنے گاہک عزیز ہیں۔ دکانیں معمولی سہی لیکن دکانداروں کے دل غیر معمولی ہیں۔
یہاں آج بھی ایسے لوگ ہیں جو اپنے عمل، قول اور فعل سے داستانوں کے کردار معلوم ہوتے ہیں۔ اطہر پرویز نے شمشاد مارکیٹ کی تقریباً

تمام دکانوں کی تفصیل بہت دلچسپ انداز میں بیان کی ہے اور وہاں کے دکان داروں کے ایسے مختصر اور جامع خاکے لکھے ہیں کہ ان کی پوری زندگی اور شخصیت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ولی محمد جبار، نواب صاحب، اسدیار خاں، صابری، میاں خاں، لالہ وغیرہ کے کردار زندۂ جاوید ہیں۔ شمشاد مارکیٹ کی سیاسی اور ادبی زندگی کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اطہر پرویز نے مجاز، اختر الایمان، خورشید الاسلام، معین احسن جذبی، جاوید کمال رامپوری، معصوم رضا وغیرہ کے بارے میں بہت دلچسپ واقعات لکھے ہیں۔ طالب علموں میں ابوسعید زیدی اور رحمٰن خاں وغیرہ کی سیاست، شرارتیں اور لطیفے بہت شگفتہ اور دلکش انداز میں بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب صرف شمشاد مارکیٹ ہی کی نہیں بلکہ علی گڑھ یونیورسٹی کی تہذیبی زندگی کی بھی داستان ہے۔ اس میں جو کردار ہیں وہ جیتے جاگتے ہیں۔ اس میں ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب بہت شوق سے پڑھی جائے گی اور قبول عام کی سند حاصل کرے گی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی سنٹینری کا شائع ہونا بہت بروقت اور برمحل ہے۔

جامعہ نگر۔ نئی دہلی

بشیر حسین زیدی

چند باتیں

"شمشاد" ایک بازار کا نام ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک تعلیمی ادارہ ہے لیکن در اصل یہ استعارے ہیں اور ان استعاروں میں آپ کو مسلمانوں کی ٹوٹی پھوٹی زندگی نظر آئے گی۔ اور اس ٹوٹی پھوٹی زندگی کے سروں کو بار بار جوڑنے کی کوشش نظر آئے گی۔

علی گڑھ مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی ہمیشہ سے کرتا رہا ہے۔ یہاں ہندستان کے مسلمانوں کی قوت بھی نظر آتی ہے اور ان کی کمزوری بھی۔ اگر آپ یہ دیکھنا چاہیں کہ ہندستان کا مسلمان کیسے سوچتا ہے تو پھر آپ کو کشمیر سے راس کماری اور آسام سے پنجاب تک سفر کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ دہلی سے ۸۴ میل علی گڑھ آجائیے۔ شمشاد میں چند روز چکر لگائیے اور عمل میں پہلے آپ کو سی آئی ڈی سمجھا جائے گا۔ ہر ایک آپ کے بارے میں چہ می گوئیاں کرے گا پھر کبھی آپ حبیب صاحب کی دکان پر چائے پیتے نظر آئیں گے، کبھی فرینڈس بک ہاؤس میں پان کھاتے۔ کبھی مختار صاحب سے بات کرتے دکھائی دیا کئے تو کبھی عطا اللہ سے۔ پھر چند روز بعد یہ نوبت آنے لگی کہ آپ علی گڑھ سے باہر جانے کا نام نہ لیں گے اور یہیں کے ہوکر رہ جائیں گے۔ در اصل علی گڑھ ایک "کالا جادو" ہے۔

میں نے کتنے نوجوانوں کو لکھنؤ سے آکر "ہائے لکھنؤ وائے لکھنؤ" کرتے

دیکھا ہے اور اپنے کانوں اور آنکھوں سے انھیں حضرت گنج اور امین آباد پر آہیں بھرتے دیکھا اور سنا ہے اور تھوڑے دنوں کے بعد یہ نوبت آئی کہ جاوید کمال کی کینٹین کے سامنے صبح و شام نظر آنے لگے۔ اور پھر انجام ہوا شمشاد کے ٹی ہاؤس پر — تو یہ ہے علی گڑھ کی چاٹ — کہ آدمی حضرت گنج اور امین آباد کو بھول جائے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آپ سارے علی گڑھ کی سیر کریں شمشاد کی دکانوں سے سودا خریدیں، لالہ کی دکان کی مٹھائی کھائیں، شرما جی کو بچّوں کے ٹی اسٹال سے اٹھا کر لے جائیں اور اپنی تصویریں کھنچوائیں، مستقیم سے شیروانی سلوائیں۔ یہاں ہر ہر قدم پر مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن سنائی دے گی۔ انھیں اپنی سرزمین سے محبت ہے اور اس کا یقین آپ اس وقت کریں گے جب آپ جبّار صاحب سے کہیں گے کہ آپ کو دہلی کے کناٹ پلیس میں ایک دکان الاٹ ہو سکتی ہے اور وہ ٹھکرا دیں گے۔ الہ آباد کے ایک مشہور جنرل مرچنٹ تھے، شجاعت حسین، بیچ چوک میں گھنٹہ گھر کے پاس ان کی دکان تھی چھوٹی سی۔ ہر وقت وہاں بھیڑ لگی رہتی تھی۔ یونیورسٹی کے لڑکے اور شہر کے عمائدین ان کے یہاں سے سودا خریدتے تھے۔ اس چھوٹی سی دکان میں شجاعت کا لاکھوں کا کاروبار تھا اور انھیں سخت تکلیف تھی لیکن وہ اپنی دکان چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ یہ لوگ وہ ہیں جنھیں زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے اتنی محبت ہوا کرتی ہے۔ وہ کیسے ایک روز ملک چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آج تک یہ لوگ نئی سرزمین میں اپنی جڑیں نہ پھیلا سکے ہوں گے۔

غالباً مس قرۃ العین حیدر نے لکھا تھا کہ ہندستان سے گئے ہوئے مہاجرین آج بھی جب ہندستان آتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ

گھر جا رہے ہیں۔ وطنیت کا یہ تصور شاید بہت پرانا ہے۔ لیکن ہندستانی کے ذہن میں آج بھی اسی طرح رچا بسا ہے۔

یہ سچ ہے کہ علی گڑھ کے لوگ کہیں بھی رہ سکتے ہیں اور اپنے آپ کو اس ماحول کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سرسید مرحوم اسی لیے یونیورسٹی کے ہوسٹلوں میں "سنگل سیٹیڈ روم" کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ ایک کمرے میں تین لڑکے رہیں تاکہ انھیں ایک دوسرے سے بات چیت کرنا، ایک دوسرے کی کمزوریوں کے ساتھ گزر بسر کرنا آجائے۔ یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کا پڑھا ہوا طالب علم جلدی دوستی کر لیتا ہے۔ علی گڑھ میں راز نہیں رکھے جاتے۔ یہاں سرگوشیاں نہیں کی جاتیں۔ آپ ہرگز یہ توقع نہ رکھیں کہ آپ کسی کے کان میں کچھ کہہ دیں گے تو وہ راز رہے گا۔ یہ لوگ کھل کر بات کرتے ہیں۔

شمشاد کو میں علی گڑھ کی نبض کہتا ہوں اور علی گڑھ کے قلب پر آپ ڈاکٹری آلہ لگا کر ہندی مسلمانوں کے دل کے مرض کو سمجھ سکتے ہیں۔ کبھی کبھی علی گڑھ سے باہر لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ علی گڑھ مسلم فرقہ پرستوں کا اڈا ہے۔ در اصل یہ خیال غلط تصور پر مبنی ہے۔ جیسے ہندستان میں اور کہیں فرقہ پرستی نہیں ہے۔ گویا مسلمانوں کا نام لینا فرقہ پرستی ہے اور اگر یہ فرقہ پرستی ہے تو پھر مولانا آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن، ڈاکٹر ذاکر حسین بہت بڑے فرقہ پرست ہوئے۔

یہ مسلمان عام ہندستانیوں کی طرح ہیں۔ ان کی کمزوریاں وہی ہیں جو عام ہندستانی کی ہیں فرق یہ ہے کہ یہاں کافی مسلمان ایک جگہ جمع ہیں چونکہ احساس کمتری کا شکار نہیں ہیں اس لیے کھل کر باتیں کرتے ہیں۔ اس کھل کر بات کرنے میں ہندستانی مزاج کو بھی دخل ہے۔ میرا خیال ہے کہ جمہوریت ہندستانی مزاج میں رچی بسی ہے۔ یہ ملک ڈکٹیٹرشپ نہیں

برداشت کر سکتا۔ یہاں تو وہ جو جی چاہے، کہنا چاہتا ہے اور کھل کر کہتا ہے۔ آپ کو اس کا اندازہ ٹرین کے سفر میں ہو جائے گا۔ یہاں آپ کو ہر شخص سیاست پر گفتگو کرتا نظر آئے گا۔ ایمرجنسی کو وہ صرف چور بازاری کرنے والے کے لیے سمجھتا ہے۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے ایمرجنسی اس کے لیے رکاوٹ نہیں ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے اس لیے علی گڑھ والے اردو کے بارے میں کھل کر باتیں کرتے ہیں، مسلمان کے ساتھ اگر کوئی بے انصافی ہوتی ہے تو کھلم کھلا اس کا ذکر کرتے ہیں اور جمہوریت کا طریقہ بھی یہی ہے اور اسی طرح ملک ترقی کرتا ہے۔

شمشاد میں ہندو اور مسلمان مل جل کر رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ اس کا اندازہ آپ اس طرح لگا سکتے ہیں کہ اگر آپ رام داس کو کٹھ پلے کے اس پار جانے کے لیے کہیں تو وہ ہرگز تیار نہ ہوگا۔ رام داس اپنی ٹوٹی پھوٹی دکان میں مست ہے۔ ممکن ہے کٹھ پلے کے اس پار اس کا کاروبار بہت اچھا چلے لیکن وہاں شمشاد کے لوگ کہاں ہوں گے بشیر صاحب کے ساتھ شطرنج کیسے کھیلی جائے گی۔

کٹھ پلے کے بارے میں کچھ عرض کر دوں۔ شاید علی گڑھ کے باہر لوگوں کو اس کے سمجھنے میں دقت ہو۔ دراصل یہ ایک لکڑی کا پل ہے جو اسٹیشن کے پاس ریلوے لائنوں کے اوپر بنا ہوا ہے تاکہ لوگ اطمینان سے ریلوے لائن پار کر سکیں۔ کٹھ پلے کے اُس پار علی گڑھ شہر بسا ہوا ہے اور کٹھ پلے کے اس طرف دو راستے ہیں اور دونوں یونیورسٹی کی طرف جاتے ہیں۔ کٹھ پلے نے یونیورسٹی اور شہر کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے حالانکہ یہ رشتہ کبھی ٹوٹ جاتا ہے لیکن جہاں امن وامان قائم ہوا یہ رشتہ پھر جڑ گیا۔ اس لیے ہم اگر علی گڑھ

کے بارے میں کوئی بات کریں تو کٹھ پُتلے کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

ہاں تو میں شمشاد کی بات کر رہا تھا۔ کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ یہ بازار نہیں ہے ایک گھر ہے تلے اوپر کے بہن بھائی یہاں رہتے ہیں جو لڑتے بھڑتے اور پھر ایک ہو جاتے ہیں۔ لالہ سے حبیب صاحب کا لاکھ اختلاف ہو لیکن حبیب صاحب یہ ہرگز پسند نہ کریں گے کہ گوکلا چورا ہے کا نام بدل دیا جائے۔

جہاں تک علی گڑھ کا تعلق ہے یہ چھوٹا موٹا ہندستان ہے لیکن اس ہندستان کو مسلمانوں کی نگاہ سے دیکھیے۔ یہ ایک مربوط کہانی ہے۔ آپ نے بچوں کا وہ کھیل دیکھا ہوگا جس میں لکڑی کے جانوروں کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ جسم کے یہ ٹکڑے الگ الگ ہوتے ہیں اور بچے کا کام ہوتا ہے ان کو ایک جگہ کر کے ایک مکمل تصویر تیار کرنا۔ علی گڑھ کی یہ کہانی کچھ ایسی ہی ہے۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے ہیں اور اب پڑھنے والے کا کام ہے ان ٹکڑوں میں ربط پیدا کرنا۔ یہ غیر مربوط اس لیے بھی ہے کہ خود علی گڑھ میں کوئی ربط نہیں ہے۔ لیکن یہ اصل بے جوڑ (...) ہے۔

آپ نے اندھوں اور ہاتھی کی کہانی پڑھی ہوگی جس میں ہر اندھے نے ہاتھی کو چھوا اور اس کے بعد ہاتھی کے بارے میں اپنے تاثرات بتائے۔ جس نے دم چھوئی۔ اس نے کہا کہ ہاتھی رسی کی طرح ہوتا ہے جس نے کان چھوئے اس کا خیال تھا کہ ہاتھی پنکھے کی طرح ہوتا ہے اور جس کے ہاتھ پیر پڑے اس کے ذہن میں ہاتھی کی تصویر ایک کھمبے کی شکل میں آئی۔ الغرض جس نے جیسا پایا ویسا بیان کر دیا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اندھوں نے غلط بات بتائی یا ان کے بیان میں صداقت نہیں تھی۔ دراصل یہ ایک قسم کی جزوی صداقت تھی۔ دراصل زندگی میں ہم سب جزوی صداقت کو دریافت کرتے رہتے ہیں۔ جن لوگوں سے ہمارا جس وقت سابقہ پڑتا

ہے اس کے مطابق ہم اس کے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں۔ کسی کے لیے کوئی آدمی بہت اچھا ثابت ہوتا ہے تو اس کے بارے میں اچھی رائے دیتا ہے۔ اور زندگی اتنی مختصر ہے کہ کسی شخص کا کوئی مکمل طور پر مطالعہ کر بھی نہیں سکتا۔

یہی علی گڑھ کا معاملہ ہے میں نے اپنے طور پر اسے جیسا پایا بیان کر دیا۔ یہ علی گڑھ کی مکمل تصویر نہیں لیکن علی گڑھ کو اس سے سمجھنے میں مدد ضرور مل سکتی ہے۔

اس کہانی میں "فلیش بیک" بہت ہیں۔ کچھ مربوط اور کچھ غیر مربوط۔ یہاں کسی ایک تکنیک کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اس کا "میں" کوئی کردار نہیں اور نہ اس کی حیثیت کسی مرکزی کردار کی ہے۔ وہ تو صرف تماشائی کے طور پر ادھر ادھر گھوم رہا ہے لیکن خالی الذہن نہیں۔ کچھ تصویریں سامنے دکھائی دیتا ہیں۔ "میں" ان تصویروں کو من وعن پیش کر دیتا ہے لیکن کچھ تصویریں اس کے ذہن میں ابھرتی ہیں، یادوں کی طرح۔ "میں" ان تصویروں کو بھی دکھاتا ہے۔ ان میں حقیقت دونوں ہیں فریب کوئی بھی نہیں۔ "میں" ان مختلف تصویروں میں ربط قائم کرتا ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے اور کہیں نہیں ہے ــــ اس لیے "میں" کو کردار کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اس چھوٹی سی بستی میں راقم الحروف اس طرح پھر رہا ہے جیسے کوئی اندھیرے میں ٹارچ لے کر چلتا ہے۔

چنانچہ اس کتاب میں ہر چند "میں" یا راقم الحروف کوئی کردار کی حیثیت نہیں رکھتا لیکن شاید بعض جگہوں پر "میں" اپنے آپ کو چھپا بھی نہیں سکا۔ بلکہ بعض اوقات کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ میں طنز میں بات کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ اس لیے مجھے جو کچھ کہنا تھا، میں نے صفائی سے کہہ دیا ہے۔ اس میں کہیں کہیں لفظوں کی کھردراہٹ بھی محسوس ہوگی۔ لیکن وہ صرف اس لیے ہے کہ میں نے لفظوں کو چبایا نہیں ہے ورنہ ان کا کھردراپن نکل جاتا۔

میں ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ میں داخل ہوا یہ بڑا ہنگامہ خیز اور تاریخ ساز دور تھا۔ اس زمانے میں میں نے جو کچھ دیکھا ہے اسے من وعن بیان کر دیا ہے۔ اس لیے کہیں کہیں، شاید سیدھے سادے واقعات میں پڑھنے والوں کو بے لطفی کا احساس ہو لیکن یقیناً وہ واقعات اس لائق تھے کہ ان کو اسی طرح بیان کیا جائے۔

اور کچھ خورد بین سے دیکھنے والوں کے لیے یہ مسئلہ سامنے آئے گا کہ اس کو کس خانے میں رکھیں۔ دراصل یہ تحریر کسی ہیئت کی پابند نہیں ہے۔ اس میں کردار ضرور ہیں واقعات بھی ہیں شمشاد کے پس منظر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی زندگی کی عکاسی بھی ملتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ ناول نہیں ہے۔ اس میں کردار محض اتفاقیہ طور پر کسی سے مماثلت نہیں رکھتے بلکہ یہ زندہ کردار ہیں۔ ان میں سب گوشت پوست کے انسان ہیں۔ ان میں سے بیشتر آج بھی زندہ ہیں۔ آپ ان سے چاہیں تو مل بھی سکتے ہیں۔ اس لیے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کتاب کو کس ہیئت کے خانے میں رکھوں۔ اگر ان کرداروں میں آپ کو کوئی خاص بات نظر آئے۔ واقعات میں کوئی نیاپن ہو۔ انداز بیان اور اسلوب میں کوئی جاذبیت ہو تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ دراصل اس کتاب میں کوئی بات بھی تخلیقی نہیں ہے۔ کوئی واقعہ بھی فرضی نہیں ہے۔ زیب داستان کے لیے کہیں کچھ بڑھایا نہیں گیا ہے۔ اس میں بیان میرا ہے باقی سب کچھ دوسروں کا ہے۔

یہ کہانی میں نے خود نہیں لکھی۔ یہ مجھ سے شمشاد نے لکھوائی ہے۔ اس میں مبالغہ نہیں ہے۔ میں نے ادب کی تخلیق کے جذبے سے کچھ لکھا ہوتا تو مجھے مبالغے کی ضرورت ہوتی! افسانویت پیدا کرنے کی خواہش ہوتی۔ میں نے اک بازار اور ایک ادارے سے متعلق چند افراد آپ کے سامنے کھڑے کر دیے ہیں، تو کہیں بٹھا دیے ہیں۔

ماضی کی یادیں بڑی خوشگوار ہوتی ہیں۔ چاہے ماضی جب "حال" تھا تو بے کیف رہا ہو لیکن اس کے اندر حسن اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ حال ماضی بن جاتا ہے۔ اسی لیے جہاں "فلیش بیک" ہے وہاں ماضی ہے۔ اور وہ اس کتاب میں ماضی کے طور پر آیا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ میں ماضی پرست ہوں۔ بلکہ میرے دل میں روایات کا بڑا احترام ہے۔ وہ روایات کیا ہیں اور کیسی ہیں۔ اگر یہ بات واضح ہو جاتی ہے تو پھر ان کی شکست و ریخت پر ماتم کرنا بجا ہے

اس سے آنکھوں میں آنسو تو آئیں گے لیکن من صاف ہو جائے گا۔ اصل صفائی یقیناً من کی صفائی ہے ۔
علی گڑھ اور شمشاد کے جن افراد کا یہاں ذکر ہے ان سب سے میرے دل میں بے پناہ محبت اور
ہمدردی ہے۔ میں ان کی خوشیوں اور غموں میں برابر کا شریک رہا ہوں۔ اس لیے مجھے یقین ہے
کہ میرے قلم سے دل آزاری کا کوئی فقرہ نہ نکلا ہوگا لیکن بعض سچائیاں رازِ درونِ پردہ
ہوتی ہیں ۔ اگر میں نے ان کو بیان کر دیا ہے تو اس میں میرے من کا کھوٹ نہیں ہے میرے
لیے علی گڑھ اور شمشاد ایک کھلی کتاب ہے۔ اس کے مطالعے پر کوئی پابندی نہیں ہے ۔ اس لیے میں
نے اپنی طرف سے کوئی کتر بیونت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اختصار کے پیش نظر بعض صفحات
روک لیے ہیں اگر لوگوں کو علی گڑھ کی اس کہانی سے دلچسپی پیدا ہو تو اگلے اڈیشن میں
ان کا اضافہ کر دوں گا ۔

میں تمام حضرات سے معافی چاہتا ہوں جن کے نام کسی نہ کسی طرح اس کتاب
میں آئے ہیں۔ میں ان کے فرضی نام بھی لکھ سکتا تھا اور روایتی انداز اختیار کرتا کہ نام
ومقام فرضی ہیں اور اگر کسی کا ذکر اتفاقیہ طور پر آگیا ہے تو مصنف اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔
چونکہ یہ تمام واقعات مشاہدے پر مبنی ہیں ۔ اس لیے میں شرمندگی کے ساتھ نہیں پیش
کر رہا ہوں ۔ میں نے شمشاد اور یونیورسٹی سے جو فیض حاصل کیا ہے اس تجربے کو دوسروں تک
پہنچانے کی کوشش کی ہے ۔

امید ہے کہ میرے پڑھنے والے میری غلطیوں کو نظر انداز کر کے اس کتاب
کا مطالعہ کریں گے ۔

آخر میں رفیق عزیز ڈاکٹر نور الحسن نقوی کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ
انھوں نے مجھے اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا اور برابر میری حوصلہ افزائی کرتے رہے عزیز
محترم جناب رشید نعمانی کا بھی مشکور ہوں کہ انھوں نے ہمیشہ مجھے کارآمد مشورے دیے
میں نے ان دونوں حضرات سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ کاش میں ان کی توقعات کو پورا کر سکوں۔

اطہر پرویز

مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ ۔ موریشس

میرا جی چاہتا ہے کہ پہلے آپ کو شمشاد مارکٹ کی سیر کرا دوں۔ شمشاد مارکٹ جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا تہذیبی مرکز ہے۔ دراصل مسلم یونیورسٹی کا صحیح تصور بغیر شمشاد مارکٹ کے ممکن نہیں۔ یہ یونیورسٹی کا مشہور بازار ہے جہاں طالب علموں کی ضرورت کی ہر چیز ملتی ہے اور ان کی ہر خواہش کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کا سرکاری نام مسلم یونیورسٹی مارکٹ ہے لیکن پبلک اسے شمشاد مارکٹ ہی کہتی ہے اور لڑکے صرف شمشاد کہہ کر کام چلا لیتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد علی گڑھ کے کچھ من چلے لوگوں کو خیال پیدا ہوا کہ ایک علی گڑھ وہاں بھی بنائیں۔ یہ خیال کوئی نیا نہ تھا کیوں کہ جب پاکستان بننے کا مسئلہ ۱۹۴۷ء سے پہلے اٹھتا تھا تو لوگ یہ سوال مسلم لیگ کے بڑے بڑے رہنماؤں سے پوچھتے تھے کہ علی گڑھ کہاں جائے گا۔ یہ ہندوستان میں رہے گا، یا پاکستان میں جائے گا علی گڑھ کا نام تاج محل کے ساتھ لیا جاتا تھا کیوں کہ لوگوں کا خیال تھا کہ علی گڑھ بھی ایک مقبرہ ہے۔ اور سچ پوچھیے تو علی گڑھ مقبرہ ہی ہے آرزوؤں اور امنگوں کا ــــ ہاں تو پاکستان بننے کے بعد یہ خیال ہوا کہ سکریٹریٹ، وائسریگل لاج، پارلیمنٹ ہاؤس، ریڈیو اسٹیشن وغیرہ کی شاندار عمارتیں تو بن ہی جائیں گی بس روپیہ ہونا چاہیے یونیورسٹی بھی بن جائے گی لیکن علی گڑھ کیسے بنے گا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ خیال عمل کی سرحدوں میں داخل ہو گیا تھا۔ اس جذبے کو حکومت کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی تھی لیکن پھر یہ بیل منڈھے چڑھتے نظر نہ آئی اور یہ خیال پھر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ مجھے

یقین ہے کہ انھیں شمشاد کا خیال آیا ہوگا بالکل سرسید ہال جیسی عمارت بھی بن سکتی تھی، اسٹریچی ہال بھی بنایا جا سکتا تھا، آسمان منزل اور مسجد بھی بن سکتی تھی۔ ممتاز ہاؤس اور آفتاب ہوسٹل کا بننا بھی مشکل نہ تھا۔ لیکن سوال تو یہ تھا کہ شمشاد کیسے بنتا۔ جو راہے میں داخل ہوتی ہوئی لالہ کی دکان کیسے بنتی چلیے آپ نے اینٹوں، پردوں اور لکڑی کے تختوں سے کسی طرح کام لے لیا، لیکن یہ بتائیے کہ حبیّر صاحب، عطاء اللہ، رام داس، حبیب صاحب، نواب صاحب اور اسد یار خاں کو کہاں سے لائیں گے۔ وہ دھول اڑتی ہوئی فضا کہاں ملے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ نہ ہوگا تو شمشاد کہاں ہوگا اور شمشاد نہ ہوگا تو پاکستان میں علی گڑھ کیسے بنے گا۔

سچ ہے تہذیبوں کے بننے میں بڑی مدت درکار ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے آپ بھی سن لیجیے، ان کے ہی الفاظ میں:۔

"ایک امریکن کروڑپتی آکسفورڈ پہنچے۔ کہتے ہیں کہ آکسفورڈ کے لان بہت ہی اچھے ہیں۔ امریکن کروڑپتی صاحب ان پر ریجھ گئے۔ فوراً جیسے کسی نے بٹن دبا دیا تو یہ سوال منہ سے نکلا: "ایسے لان کتنے میں تیار ہو جائیں گے؟ ساتھ جو پروفیسر صاحب تھے انھوں نے کہا کہ "میں تو علم الانسان شعبے کا صدر ہوں، ان تفصیلات سے بالکل ناواقف ہوں، آپ کہیں تو مالی کو بلا دوں۔ آپ ان سے دریافت فرمالیں"۔

"بلا لیجیے"۔ مالی آیا۔ کروڑپتی صاحب نے کہا "ہم بالکل ایسا ہی لان اپنے یہاں چاہتے ہیں۔ کتنے میں تیار ہو جائے گا؟" مالی نے کہا "صاحب! اس میں کتنے کا کیا سوال ہے، کوڑیوں میں تیار ہوتا ہے، کوڑیوں میں۔ زمین تو آپ کے پاس ہوگی ہی، ذرا اچھی ہموار کرا لیجیے گا، اس میں گھاس جما دیجیے گا۔ جب گھاس ذرا بڑھ جائے تو اسے کاٹ کرا دیر سے رولر پھیر دیجیے گا اور بس۔ یہی کوئی پچھلے پانچ سو برس کرتے رہیے گا۔ بس ایسا لان تیار ہو جائے گا۔"

شمشاد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا صدر دروازہ ہے۔ اسی میں داخل ہو کر یونیورسٹی میں جاتے ہیں۔ یونیورسٹی بھلے ہی کسی طالب علم کو داخلہ نہ دے،

شمشاد بھی دروازے مہمان کا استقبال کرتے ہیں اور اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دیتے۔ آپ علی گڑھ میں کہیں بھی چلے جائیں اور کسی بھی رکشے والے سے شمشاد کہہ کر اس کی رکشا میں بیٹھ کر شمشاد میں دندناتے ہوئے داخل ہو سکتے ہیں۔ کسی نے کہا تھا کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ سچ ہے نام تو محض جگہوں کو پہچاننے کے لیے ہے۔ لیکن آپ یہ بات علی گڑھ میں نہ کہیے گا یہاں پر لوگ جذبات کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں۔ اس دیوانی عورت کی طرح جو اپنے بچے کو اس کے مرنے کے بعد بھی یہ کہتی تھی کہ "یہ میرا بچہ ہے" اور اپنی سوکھی ہوئی چھاتی اس کے منھ میں ٹھوس دیتی تھی کہ "لے بٹیا پی لے ــــ لے بٹیا پی لے ــ اسی سے تیرے بدن میں طاقت آئی تھی"

ہاں تو یہ بازار اس لیے شمشاد مارکٹ ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے بیٹے شمشاد احمد خاں نے اس اجڑے علاقے میں چند دکانیں بنوائی تھیں۔ اسی الوپ شہر روڈ کے مغربی طرف۔ آپ نے اگر دیکھا ہوگا تو کہیں گے کہ وہ دکانیں اب کہاں گئیں؟

بھائی، یہ جبّار صاحب، نیاز بھائی، مطیع الرحمٰن، علی محمد، بہادر اور قادر وغیرہ کی دکانیں۔ یہ سب دکانیں ہی تو ہیں۔ آپ عمارت کیوں ڈھونڈتے ہیں، یہی تو اس کا طرۂ امتیاز ہے کہ عمارت نہیں ہے لیکن دکانیں لگی ہوئی ہیں۔ کاش اس زمانے میں جب شمشاد احمد خاں نے یہ بازار بنایا تھا تو کوئی فوٹوگرافر اس کی تصویر لے لیتا اور ہمیں اصل دکانوں کا حلیہ معلوم ہوتا کیوں کہ پھر تو ایسا پردہ پڑا ہے کہ اب شمشاد مارکٹ اپنے آپ سڑک کے اس پار بھی آ گیا ہے جہاں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی دو عظیم بلڈنگیں ہیں ــــ اسماعیلیہ بلڈنگ اور حامد علی بلڈنگ ـ

چنانچہ سڑک کے دونوں طرف کی دکانیں اب شمشاد مارکٹ کہلانے لگیں۔ حالانکہ بزرگوں کا کہنا ہے کہ مسجد کے داہنی طرف جہاں اسد یار خاں

رہتے ہیں۔ اس کے نیچے جو دکانیں ہیں، جیسے کیمرہ کرافٹ، شوکو، راما بکڈپو، سنگھل کی دکان، دادا آڈرانی کلینرز ـــــ اصل شمشاد مارکیٹ یہ تھیں ـــ لیکن جس طرح یہ ہوتا آیا ہے کہ بالآخر ہر نظریہ دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ شیعہ اور سنی، کمیونسٹ پارٹی رائٹ اور کمیونسٹ لفٹ، کانگرس نیو اور کانگرس اولڈ ـ اسی طرح شمشاد بھی دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک الوپ شہر روڈ کے اس پار اور ایک الوپ شہر روڈ کے اُس پار ـ

اب ذرا دھیان دیجیے گا تو سمجھ میں آئے گا کہ مسجد کے ایک طرف جس کے بالائی حصے میں اسد یار خاں رہتے ہیں اور مسجد کے دوسری طرف جس میں اسد یار خاں کا دفتر ہے اس عمارت میں ہر طرف دکانیں ہیں۔ یہ ہوا کانگریس اور ـ اگر سنجے گاندھی کے یوتھ کانگریس والے ان کی صفائی پر اتر آئیں تو معلوم ہوگا کہ یہ دکانیں نہیں ہیں دھوکے کی ٹٹی ہیں ـ یہ سب کچھ ان کا ظاہر ہے باطن نہیں ہے ـ اگر آپ تختیں اور پردوں کو دکانیں کہہ سکتے ہیں تو بے شک یہ دکانیں ہیں اور شاندار دکانیں ـــــ دکانیں رکا نا تو کوئی ان شمشاد کے دکانداروں سے سیکھے ـ مجھے یقین ہے کہ جنگل میں منگل والی بات ایسے ہی لوگوں نے کی ہوگی۔

مجھے یاد آیا ـ بہت پرانی بات ہے مگر اتنی پرانی بھی نہیں ـ غالباً سنہ ۱۹۶۱ کی ہوگی ایک فساد ہو گیا تھا ـ پتا نہیں کس بات پر ـــ لیکن فساد کے لیے کسی بات کا ہونا ضروری نہیں ہے ـ میں یونیورسٹی سے دوپہر کو کھانا کھانے آیا۔ معلوم ہوا کہ جھگڑا ہو گیا ـ بیوی نے کہا "بچوں کو اسکول سے لے آؤ سنا ہے اس وقت کہیں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے ـ میں منٹو سرکل گیا ـ بشیر صاحب میرے بچوں کو اپنی موٹر سائیکل پر لیے ہوئے چلے آرہے تھے ـ وہی فرینڈس بک ہاؤس والے بشیر صاحب ـ اتنی دیر میں یہاں آگ لگ چکی تھی میرے دیکھتے دیکھتے بازار بند ہو گیا ـ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو یہاں ہو کا عالم چھایا ہوا تھا ـ اتنے میں شور کی آواز سنائی دی شور بھی کچھ ایسا نہ تھا جیسے کوئی چوری کر رہا ہو اور خوف سے چیخ نکل

جاتے۔ پندرہ بیس لڑکے مشعلیں لیے ہوئے دکانوں میں تیل چھڑک چھڑک کر اس میں آگ لگا رہے تھے۔ پھر اکدم سے ایک شور اٹھا۔ ایک بڑا شور جس نے اس چھوٹے سے شور کو دبا دیا۔ لوگوں نے گھروں سے نکل کر ان لڑکوں کو دوڑا دیا۔ پھر تو یہ آگ لگانے والے لڑکے دُم دبا کر بھاگے۔ ڈاروِن اگر اس منظر کو دیکھتا تو اس کو اپنے نظریے کی پختگی کا اور شدت سے احساس ہوتا۔ ہاں تو اس کے بعد پھر ایک ہنگامہ ہوا۔ کچھ اور دکانیں لوٹی گئیں۔ انجنیر بگ کی دکان، جبار صاحب کی دُکان، بہادر کی دکانیں تو پہلے ہی لٹ چکی تھیں، لیکن حساب برابر نہیں ہوا تھا۔ اب راما بک ڈپو سنگھل بک ایجنسی اور فوٹو کرافٹ کی باری تھی۔ غرض یہ ہنگامہ بھی ختم ہوگیا۔ پھر قاعدے قانون کی عملداری ہوئی۔ کرفیو نافذ ہوگیا۔ شمشاد میں سناٹا چھاگیا۔ لاؤڈ اسپیکر سے لتا منگیشکر اور محمد رفیع کی آواز بند ہوگئی، جو اپنی تمام تر موسیقیت کے باوصف کانوں کے پردے پھاڑتی تھیں۔

میں جب بھی لکھنے پڑھنے کا کوئی کام کرتا ہوں یہ آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ میں ان آوازوں سے شروع شروع میں اسی طرح جھنجھلاتا تھا جیسے الف لیلہ کا شہزادہ پہاڑ پر چڑھتے ہوئے طرح طرح کی آوازوں سے گھبراتا اور پیچھے مڑ کر دیکھتا اور ان آوازوں کو ڈانٹنا چاہتا تھا لیکن پھر اس ڈر سے مڑ کر نہ دیکھتا تھا کہ مبادا میں بھی کہیں پتھر کا نہ ہو جاؤں۔ میں نے مڑ کر تو نہ دیکھا نہ شہزادی کی طرح کان میں روئی رکھی۔ میں تو پھر ان کا عادی ہوگیا۔ یہ آوازیں میری زندگی کا حصہ بن گئیں۔ میرا تصنیف و تالیف کا سارا کام شنکر جے کشن، نوشاد، لکشمی کانت پیارے لال، مدن موہن وغیرہ کی دھنوں پر ہوا۔

خیر اس کو چھوڑیے اصل قصہ سنیے، بات یہ ہے کہ پھر اس ہنگامے کے بعد دکانیں کھل گئیں۔ دکاندار اپنی اپنی دکانوں میں آگئے اور ہر دکاندار دوسرے دکاندار کے سامنے اپنی بربادی کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا تھا اور نقصان کا اندازہ ہزاروں پر لگا کر بتا رہا تھا۔ حالانکہ ان میں ہزار روپے

والا سامان نہیں تھا لیکن منافع چھپانا اور نقصان بتانا تو کاروبار کی امتیازی خصوصیت ہے۔ خیر اس کو چھوڑیے۔ اب یہ لوگ جلا ہوا سامان سمیٹ رہے تھے کہ اطلاع ملی کہ کوئی منسٹر دیکھنے آرہے ہیں۔ بس پھر کیا تھا دکانداروں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر ایک اپنی دکان کو سجانے میں لگ گیا۔ اور ذرا سی دیر میں دکانیں معزز مہمان کے استقبال کے لیے تیار ہوگئیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ انھوں نے صفائی کر دی۔ جی نہیں انھوں نے اسی بے ترتیبی سے جلے ہوئے سامان اور راستوں کو نمایاں کر دیا اور راکھ کا ڈھیر سادھو کی سمادھی کی طرح نظر آرہا تھا۔ منسٹر صاحب اپنے ساتھ پولیس لے کے آئے، دیکھا اور چلے گئے چھوڑ کر لوگوں کو پریشان کرنے کے لیے۔ سوچنے لگے سب تھے کہ کس کو کتنا ملے گا۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک اور خبر اڑی کہ کانگریس کے کچھ نیتا آرہے ہیں۔ ادھر ادھر کے دو ہولی بیڑ چھیڑ گئی اور پھر اسی طرح نمائش ہونے لگی۔ اگر کوئی خریدار آتا منسٹر ہے۔ آیا تو نہیں تو دکاندار اس سے کہتے "ذرا ہٹیے یہ بکری کا وقت ہے؟ دیکھتے نہیں کہ کوئی لیڈر آرہا ہے۔"

غرض یہ کانفرنس کی بربادی پر ان کی قیمت بڑھ رہی تھی جس میں زیادہ نقصان کے نظر آتے تھے ان کی قیمت اتنی ہی زیادہ تھی۔ یہ سلسلہ کئی روز چلتا رہا۔ دکانوں کی بربادی روز افزوں تھی یو پی کے دو بڑے ملی چند مہمان کل آرہے ہیں۔ بس پھر کیا تھا سجاوٹ شروع ہوگئی۔ بربادی کے آثار اور نمایاں ہو گئے۔ لوگوں نے اپنی دکانوں میں دیر رات تک کام کیا۔ لیکن جب میں صبح کو ٹہلنے کے لیے نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ان جلے ہوئے تختوں اور کنستروں کو پولیس والے اپنی گاڑی میں بھر رہے ہیں اور دکانیں صاف کر رہے ہیں اور چند لڑکے اور شمشاد کے کتے حسرت سے یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کتوں کو بھی معلوم ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ صبح کو دس بجے دکاندار اپنی دکانیں کھولنے آئے تو وہاں سب کچھ صاف ہو گیا۔ اور تو کچھ بن نہیں پڑا سب چپ کیے ہوئے پر لوٹ رہے تھے کہ ہم تم کو ایک روپیا

مہینہ اسی لیے دیتے ہیں کہ ہماری دکانیں لٹ جائیں۔ خوب کرتے ہو چوکیداری۔ آج سے تمھارا چوکیدارا بند۔ وہ بیچارا کہتا رہ گیا کہ پولیس والوں کے سامنے ہم کیا کرتا لیکن اس کی کون سنتا۔ حالانکہ اس کا چوکیدارا کبھی بند نہیں ہوا۔ کیوں کہ ان دکانداروں کا غصہ تو پنڈت جواہر لال نہرو کا غصہ تھا آیا اور گیا۔ اور اس کے بعد تو اس ایک روپے میں گرانی الاؤنس کا اضافہ بھی ہو گیا۔

ایک بجے کے قریب سی۔ بی گپتا آنے والے تھے۔ تمنا فاروقی کے یہاں مارکیٹ کے عمائدین کا جلسہ تھا کہ سی۔ بی گپتا سے اس عظیم نقصان کے بارے میں کون بات کرے۔ یہ قرعہ اس مارکٹ کی ایک اہم شخصیت کے نام پڑا اور نواب صاحب کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ وہ وزیر اعلیٰ سے بات کریں۔ ان کو تمام باتیں بتائی گئیں۔ تمام ڈائلاگ رٹا دیے گئے۔ کافی دیر ریہرسل ہوا۔ لیکن جب سی۔ بی۔ گپتا آئے تو نواب صاحب کو لوگ ڈھونڈ رہے تھے ان کا دور دور پتا نہ تھا۔ کسی نے لپک کر گھر میں آواز دی تو پتا چلا کہ نواب صاحب غسل کر رہے ہیں۔ اب نواب صاحب لباس تبدیل فرما رہے ہیں اور جب وہ گھر سے نکلے تو سرشار کے میاں آزاد بن کر ——— سی۔ بی۔ گپتا بیچ بازار میں پہنچ چکے تھے اور نواب صاحب شمشاد کے ممتاز افراد کے ساتھ جن میں کچھ ترکاری والے کچھ ہوٹل والے، اور کچھ لڑکے تھے جو ہمیشہ وہاں پائے جاتے ہیں ——— ایسا لگتا ہے کہ یہ لڑکے کبھی جوان نہیں ہوتے۔ سدا بہار ہیں ——— اور ہمیشہ وہاں نظر آتے ہیں۔

نواب صاحب اس مجمع کے ساتھ آگے بڑھے۔ انھوں نے جھک کر سی۔ بی۔ گپتا کو فرشی سلام کیا۔ سی۔ بی۔ گپتا ان کا حلیہ دیکھ کر دیسے ہی سٹپٹا سے گئے جیسے کوئی چار باغ اسٹیشن پر خوجی کو دیکھ کر ہونق ہو جائے۔ لیکن پھر کرنل زیدی نے ان کو سہارا دیا۔ سی۔ بی۔ گپتا کے ہوش و حواس واپس آگئے لیکن نواب صاحب اپنے ڈائلاگ بھول چکے تھے، گھگھیا کر رہ گئے اور سی بی گپتا چلے گئے۔ جب

کی دکان سے ہوتے ہوئے چوراہے پر پہنچ گئے اور انجینئرنگ کی دکان کی بربادی دیکھ کر گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔

البتہ اس میں ایک بات رہ گئی کہ شمشاد مارکٹ کی تمام دکانیں کوٹے کرکٹ اور جلے ہوئے تختوں سے پہلے سے زیادہ آراستہ ہوگئی تھیں۔ایسا لگتا تھا کہ ابھی ابھی کوئی آگ لگا کر گیا ہو۔میں کہتا ہوں کہ بربادی کی سجاوٹ تو کوئی ان سے سیکھے۔ اسی لئے تو میں نے کہا کہ آپ کو دکان الاٹ نہیں صرف دو گز زمین ہونا چاہیے شمشاد سے کسی دکاندار کو پکڑ کر لے جائیے۔ دو گز زمین پھیل کر بیس گز زمین ہو جائے گی۔ہلدی کی ایک گانٹھ سے آپ کو پنساری کی دکان کا شبہ ہوگا۔

یہ کمال ہے ان دکانداروں کا ــــ کتنے ہنرمند ہیں وہ لوگ ــــ

میں آپ سے یونیورسٹی کے بازار کا تعارف کرارہا تھا اور اس فساد کا قصہ لے کر بیٹھ گیا۔بات محض اتنی تھی کہ نام میں کیا رکھا ہے۔مجھے یاد آیا کہ چوراہے کی طرف اگر میکڈانلڈ ہوسٹل کی طرف سے جائیں تو یہاں آپ کو فوٹو گرافر کی دکان کے بعد ہی چند دکانیں نظر آئیں گی۔آج کل یہاں کرائے کی سائکلیں ملتی ہیں اور سائکلوں کی مرمت بھی ہوتی ہے۔یہ دکانیں بھی شمشاد کا ایک حصہ ہیں پہلے یہاں ولی محمد کا ہوٹل تھا۔یہی نام تھا، بورڈ تو تھا نہیں، لیکن پوچھنے پر معلوم ہوتا کہ یہی ولی محمد کا ہوٹل ہے۔یہاں نقد بل ادا کرنے کی ضرورت نہیں تھی، یہاں ہر ایک کا اکاؤنٹ چلتا تھا ــــ ہر لڑکے کا اکاؤنٹ جسے علی گڑھ کی زبان میں "ارتھمٹیک" کہتے ہیں۔ہوٹل کا سارا کام ولی محمد اور اس کے بیٹے کرتے تھے۔

جہاں تک اکاؤنٹ چلنے کا معاملہ ہے، شمشاد کا دستور نرالا ہے۔یہاں صرف کھانا ناشتہ قرض نہیں ہوتا بلکہ ضرورت پڑنے پر روپے بھی نقد مل جاتے تھے۔میں نے اکثر دیکھا کہ لڑکے رکشا پر سامان لیے ہوئے آتے اور ولی محمد سے بیس پچیس روپے لے کر چلے جاتے، اور ولی محمد ان سے کبھی یہ نہ پوچھتے کہ پچھلے کھانے کے روپے کب دو گے، اور ہوتا بھی یہ تھا کہ ولی محمد کا ہوٹل ان لڑکوں کی بدولت آباد ہوتا تھا

اور گرمیوں کی چھٹیوں میں یہاں سناٹا چھا جاتا۔ یہ بات بہت پرانی ہے۔ اٹھارہ انیس سال پہلے کی۔ کیوں کہ جب سے یونیورسٹی میں سمسٹر سسٹم شروع ہوا، شمشاد میں خزاں نہیں آئی۔ شمشاد سدا بہار رہتا ہے۔ گرمیوں میں بھی امتحان ہوتے ہیں اور امتحان نہیں ہوتے تو داخلے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شمشاد کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ لیکن جس زمانے کی بات میں کر رہا ہوں یعنی سن ستاون کی، اس زمانے میں گرمی کے آتے ہی شمشاد میں ویرانی چھا جاتی۔ اس وقت ولی محمد اپنے لڑکے کو ذمہ داری سپرد کر کے دورے پر نکلتے۔ وہ اس طرح بن ٹھن کر جاتے جیسے کوئی حج کرنے جا رہا ہو۔ وہ مختلف جگہوں پر جاتے جہاں ان کے "کسٹمر" ہوتے۔ وہ کبھی لڑکوں کے والدین سے روپیوں کا تقاضا نہ کرتے ان کو دیکھ کر لڑکے خود ہی سمجھ جاتے کہ ضرور ولی محمد پریشانی میں آئے ہیں۔ لڑکے خوب خاطر مدارات کرتے۔ ان کے لیے روپیے کا چپ چاپ انتظام کرتے اور پھر والدین سے انعام لے کر رخصت ہوتے اور وہاں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی کہ ولی محمد کیوں آئے تھے۔ جب وہ چلے جاتے تو گھر کی عورتیں اپنی پڑوسنوں سے کہتیں — ان کا یونیورسٹی میں بہت بڑا ہوٹل ہے۔ بھیا کو بہت مانتے ہیں اور ان کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ ادھر سے گزر رہے تھے۔ بھیا کو دیکھنے چلے آئے اور بھیا کی پوزیشن اور اونچی ہو جاتی۔ اس لیے کہ ان کو کیا معلوم کہ بھیا علی گڑھ میں کس کس کا قرض چھوڑ کر آئے ہیں۔

علی گڑھ کے لڑکوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ سارا کام قرض پر چلاتے ہیں۔ یونیورسٹی اور ہوسٹل کی فیس یہ نہیں دیتے، ہوٹل کا بل یہ نقد ادا نہیں کرتے۔ سگریٹ یہ ادھار پیتے ہیں — لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے گھروں سے روپیا نہیں آتا۔ روپیا تو ماں باپ بھیجتے ہی ہیں یہ لڑکے اپنی معصوم بہنوں کو شیشے میں اتار کر وہ روپیا بھی اینٹھ لیتے ہیں جو وہ بیچاری جمع جوڑ کر رکھتی ہیں اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتیں۔ بس اس کے بدلے

انھیں نمائش کی چوڑیاں مل جاتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ یہ روپیا کہاں کہاں خرچ کرتے ہیں۔ اب اس کی تفصیل میں کیوں جائیے یونیورسٹی میں لڑکے عام طور پر امتحان سے چند روز پہلے فیس ادا کرنے کے سلسلے میں پریشان ہوتے ہیں۔ یہ وقت وہ ہوتا ہے جب یونیورسٹی سختی سے بقایا کا تقاضا کرتی ہے اور یہ۔ وہ صاف صاف الفاظ میں کہہ دیتا ہے کہ اپنے بقایا کی پوری رقم ادا کرو تب ہال ٹکٹ ملے گا۔ ہال ٹکٹ گویا امتحان ہال میں داخل ہونے کا پروانہ ہے۔ اس میں طالب علم کا رول نمبر لکھا ہوتا ہے اور امتحان کے کمرے میں اس کی چیکنگ ہوتی ہے۔ اب لڑکا دوڑ دھوپ شروع کرتا ہے اور جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو اپنے استادوں کے چکر لگاتا ہے۔ اور ان سے کہتا ہے کہ وہ ضمانت لے لیں۔ عام طور پر علی گڑھ کے استاد اپنے شاگردوں کو مایوس نہیں کرتے اور رقم ان کی تنخواہ سے کاٹ لی جاتی ہے جس وقت استاد یہ تحریر لکھتا ہے۔ اس وقت طالب علم کہتا ہے ڈاکٹر صاحب! میرے والد نے منی آرڈر بھیج دیا ہے۔ کل یا پرسوں تک آجائے گا۔ جیسے ہی آیا، میں اکاؤنٹ آفس میں جاکر ادا کر دوں گا۔ آپ کو پتا بھی نہ چلے گا۔ لیکن کل میرا امتحان ہے ورنہ آپ کو زحمت نہ دیتا۔"

ہر استاد اپنے شاگرد کی بات پر یقین کر لیتا ہے اور سابقہ تجربے کو بھول جاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا طالب علم ہو جس کو اس تجربے سے نہ گزرنا پڑا ہو۔

جب کرنل سید بشیر حسین زیدی وائس چانسلر ہو کر آئے اور انھیں یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے استادوں کی ہمدردی میں ایک حکم نامہ جاری کیا کہ آئندہ یونیورسٹی کے استادوں کی ضمانت نہ قبول کی جائے اور انھوں نے استادوں کو ایک خط لکھا کہ وہ ایسی ضمانتیں آئندہ نہ داخل کریں جو تنخواہ سے متعلق ہوں۔ لیکن اس سرکلر کا استادوں پر الٹا اثر پڑا۔ زیدی صاحب سمجھتے تھے

کہ استاد خوش ہوں گے لیکن استادوں کو تکلیف ہوئی اور انھوں نے شکایت کی
"اگر ہم ہی ایسے موقع پر اپنے شاگردوں کے کام نہ آئے تو پھر کب آئیں گے۔"
اب یہ ہوا کہ استادوں نے خصوصی اجازتیں لے لے کر ضمانتیں داخل کرنا شروع
کردیں اور پھر تو یہ سلسلہ عام ہوگیا۔ اور لڑکوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔
زیدی صاحب مایوس ہو گئے وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ البتہ جب زیدی صاحب
اپنے وائس چانسلر کے منصب سے سبکدوش ہوئے تو انھوں نے اپنی الوداعی
تقریر میں فرمایا کہ "علی گڑھ سے میں جو یادیں لے جا رہا ہوں ان میں استادوں
اور شاگردوں کا یہ رشتہ ہے جو بے حد مضبوط اور عدیم المثال ہے۔ میں جانتا
تھا کہ استادوں کی تنخواہیں قلیل ہیں اور یہ سالانہ رقم جو ان تنخواہوں سے وضع
ہوتی ہے بہت زیادہ ہے۔ لیکن میں اس جذبے کی قدر کرتا ہوں جو روپے
پیسے سے بالاتر ہے۔"

غرض یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ آج بھی فیس کے لیے استاد ضمانتیں داخل
کرتے ہیں اور پھر یہ رقم ان کی تنخواہ سے وضع ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ علی گڑھ کے
لڑکے کبھی شمشاد کے دکانداروں کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاتے اور شاید
ان ہی کی برکت ہے کہ شمشاد کا کاروبار اسی "شان و شوکت" سے چلتا ہے اور عید
اور بقرعید میں خاص خاص دکاندار لڑکوں کے ساتھ شامیانے بھی لگائے جاتے ہیں۔

ہاں تو میں ولی محمد کے دورے کا ذکر کر رہا تھا۔ ولی محمد کے ہوٹل کا
اگلے سال کا خرچ اسی دورے سے چلتا ہے۔ فرنیچر میں تھوڑا بہت تبدیلی ہو
جاتی تھی۔

ایک دن کیا دیکھا کہ ولی محمد کے ہوٹل میں سفیدی ہو رہی ہے اور اب یہ
ریستوران بن گیا ہے۔ اس کا نام "گے لارڈ" پڑ گیا۔ فرش پر پلاسٹر ہوگیا۔ نرگس
اور ثریا کی تصویریں دیواروں پر لگا دی گئیں۔ ایک صاحب "سوٹڈ بوٹڈ" ہو کر
پر چشمہ لگائے بیٹھے ہیں۔ اب باقاعدہ بل دیا جاتا ہے اور ادائگی ہوتی ہے۔ بیرے

ڈریس میں ہیں۔ اس لیے انھیں ٹپ بھی دینا پڑتا ہے۔ وہ ٹپ لے کر بڑے شان سے سیلوٹ کرتے ہیں۔ لڑکوں کو "گے لارڈ" کا یہ انداز ایک آنکھ نہیں بھایا۔ بہت چڑ بڑ ہوئے لیکن کرتے تو کیا، اگر روم میں رہنا ہے تو وہی کرو جو رومن کرتے ہیں۔ سب کو اس کا غم تھا کہ ولی محمد نے بلاوجہ یہ ہوٹل بیچ دیا۔ لیکن بازار میں ولی محمد نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ لڑکوں سے چھپے چھپے پھر رہے تھے جیسے انھوں نے کوئی بُرا کام کیا ہو۔ غالباً وہ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ لڑکوں کے سامنے کس منہ سے جائیں گے۔ اگر کوئی لڑکا پوچھ بیٹھا کہ "تم نے ہمارا ہوٹل کیوں بیچ دیا؟" تو وہ کیا جواب دیں گے۔ اسی لیے وہ چوروں کی طرح چھپے ہوئے تھے۔ انھوں نے بلیک بھی تو نہیں کیا، کیوں کہ بلیک کرنے والے تو سر بازار پھرتے ہیں اور معزز سمجھے جاتے ہیں۔ (یہ بات میں ایمرجنسی سے پہلے کی کہہ رہا ہوں) ہاں تو "گے لارڈ" کی رونق دن بہ دن کم ہوتی گئی۔ اس کی بیشتر میزیں اور کرسیاں خالی نظر آنے لگیں، اور نہ جانے اس کا کیا حال ہوتا کہ اچانک ایک روز ایک لڑکے کی نظر پڑی تو کیا دیکھتا ہے کہ ولی محمد "کچن میں [illegible]" —— اس نے کہا "ارے ولی محمد! تم یہاں کہاں؟"

اب پتا چلا کہ ولی محمد اس ہوٹل کو بیچ کر یہاں ملازمت کر رہے تھے۔ بس کیا تھا۔ پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب تو پھر ہر چیز کے لیے ولی محمد کو آواز دی جاتی۔ چند روز میں "گے لارڈ" کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ "گے لارڈ" کا نام صرف بورڈ پر رہ گیا۔ گویا ولی محمد کا نام پھر واپس آگیا۔ لڑکوں کا حساب حسبِ معمول چلنے لگا۔

پھر کئی سال کے بعد ولی محمد کے لڑکے نے مسجد کے عقب میں خالی زمین پر چند میز کرسیاں ڈال لیں اور ایک کچن بنالیا۔ اور یہ ہوٹل وہاں منتقل ہو گیا۔ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ اخترالایمان وہاں سے چوری چھپے نکل رہے ہیں۔ میں نے لڑکے کو [illegible] انھیں [illegible] با۔ جب اخترالایمان یہاں آئے تو ولی محمد

کے کھانے کی تعریفیں کرتے رہے۔ ویسے وہ برسہا برس سے میرے دسترخوان کے بھی مداح ہیں لیکن ولی محمد کے اس ہوٹل میں کھانے کا ذائقہ وہ کبھی نہیں بھول سکتے۔ اختر نے اپنے لڑکے کو بھی بتا دیا ہے کہ کھانا اچھا ہوتا ہے۔ بمبئی میں رہنے کی وجہ سے ولی محمد کے ہوٹل کا کھانا، ان کے لیے اتنا ہی پڑتا ہے جتنا کہ وہ وہاں بیرے کو ٹپ دیتے ہیں۔

یہ بات نام سے نکلی تھی۔ مجھے اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آیا۔ یہ بات ہے ۱۹۴۱ء کی۔ مجاز مرحوم کو علی گڑھ چھوڑے ہوئے بہت زمانہ نہیں گزرا تھا۔ وہ برابر علی گڑھ آتے رہتے تھے۔ محمود صاحب کے یہاں ٹھہرتے تھے اور جس زمانے میں وہ وہاں آتے تھے، تو مختلف ہوٹلوں سے ان کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ان کا زیادہ تر وقت طالب علموں کے ساتھ گزرتا تھا۔

مجاز مرحوم علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے اور بقول شخصیکہ علی گڑھ کی رگ رگ سے واقف تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی نظم "میرا چمن" میں علی گڑھ کی صحیح شخصیت کو پیش کر دیا ہے وہ چاہے" ناہید" سے سرگوشی کریں یا "پروین" سے رشتے جوڑیں "یا قبائیں نوچیں" یا" ذرات کے بوسے کے لیے آکاش کو زمین سے اتاریں" وہ ان سب میں علی گڑھ کے کردار کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہ سب استعارے ہیں۔ علی گڑھ والوں کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں پر بھی ناز کرتے ہیں چنانچہ یہ یونیورسٹی کا ترانا بن گیا۔ اشتیاق محمد خاں بھی علی گڑھ کے دلوانے تھے انھوں نے موسیقی کی باقاعدہ تربیت نہیں حاصل کی تھی لیکن ترانے کی وہ دھن بنا دی کہ نوشاد اور خیام بھی چاہیں تو نہیں بنا سکتے، اس لیے کہ یہاں موسیقی کا فن جاننا اتنا ضروری نہیں جتنا کہ علی گڑھ کو جاننا ضروری ہے۔ اور اشتیاق صاحب نے علی گڑھ میں پڑھا بھی ہے اور پڑھایا بھی ہے۔

بات مجاز مرحوم کی تھی کہ وہ علی گڑھ کے عاشق بھی تھے اور معشوق بھی
کتب پبلشرز نے نئے ادیبوں پر کتابچوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس
کا نام تھا "نئے ادیبوں کا معمار"۔ اس سلسلے میں عصمت چغتائی نے مجاز کا خاکہ لکھا
تھا جس میں انہوں نے اس واقعہ کا ذکر کیا تھا کہ گرلز کالج کی لڑکیاں مجاز پر
جان چھڑکتی تھیں اور ان کے نام کا قرعہ ڈالا کرتی تھیں کہ مجاز کی شادی کس
سے ہوگی۔ یہ ان لڑکیوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علی گڑھ کے
کمرے کمرے سے مجاز مرحوم کی نظم "آوارہ" کے نغمے سنائی دیتے تھے۔ یہ غالباً
۱۹۴۶ء کی بات تھی۔ مجاز نے بھی یہ کتابچہ پڑھا اس کے بعد میری ملاقات الہ آباد
کے اسٹیشن پر مجاز سے ہوئی وہ بمبئی سے آ رہے تھے۔ مجھ سے دریافت
کیا "تم نے عصمت کا مضمون پڑھا" میں نے کہا "ہاں ۔۔ بہت اچھا ہے"
کہنے لگے "ارے میاں! اس المیہ پر نظر نہیں پڑی کہ" میرے نام گرلز
کالج کی لڑکیاں قرعے ڈالا کرتی تھیں اور سنو عصمت بھی ان قرعوں میں شریک
ہوتی تھیں ۔۔ لیکن ٹریجیڈی یہ ہے کہ ایک طرف تو ہمارے نام کے قرعے پڑتے
تھے اور دوسری طرف ہم لڑکی کی شکل دیکھنے کو ترستے تھے۔ یہ لڑکیاں
واقعی ظالم ہوتی ہیں عشق ہم سے کرتی ہیں اور شادی شاہد لطیف سے۔"

اردو شاعری میں غالب کے بعد مجاز ہی تھے جن کے لطائف زبان
زد ہیں۔ مجاز حاضر جواب تھے۔ زبان سے بات نکلی اور انھوں نے جملہ چست
کیا۔ ایک روز میں ان کے ساتھ چاندنی چوک سے گزر رہا تھا اتوار کا دن
تھا۔ چاندنی چوک کی دکانیں بند تھیں۔ ایک دکان پر بہت ہی بڑا تالا لٹکا
ہوا تھا۔ میں نے کہا "مجاز صاحب! یہ تالا دیکھیے۔

مجاز مرحوم نے مڑ کر دیکھا اور بولے "میاں یہ تالا ہے ۔۔۔ یا اسد
اللہ خاں۔"

مجاز چوکتے نہ تھے۔ زبان پر آیا ہوا لفظ کبھی واپس نہ لیتے تھے اور

جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی کو مجاز سے شکایت نہیں ہوئی۔ جن لوگوں نے مجاز کو قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کا منہ بہت چھوٹا تھا۔ مجاز کہا کرتے تھے کہ بھائی یہی تو بات ہے جو میں بڑی بات کرتا ہوں"۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مجاز مرحوم برابر علی گڑھ آتے رہا کرتے تھے۔ خورشید الاسلام صاحب کے کمرے میں ۹۰ نمبر آفتاب ہوسٹل میں ان کی محفلیں جمتیں۔ وہاں سے جب وہ شام کو اٹھتے تو میکڈانلڈ کی پلیا کر اس سڑک کے اس پار آکر بیٹھ جاتے۔ جہاں اب سائیکل والے کی دکان ہے۔ امپلائمنٹ ایکسچینج کے پھاٹک کے سامنے۔ یہاں ایک بڈھے کی جھونپڑی تھی۔ یہ بوڑھا جاڑے میں کباب بناتا اور گرمی میں آئس کریم۔ کبھی کبھار وہ چائے بھی بنا لیتا۔ مجاز مرحوم یہاں پابندی سے آتے۔ اور اس کی ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر آئس کریم کھاتے اور چائے پیتے اور اس کا حقہ پیتے ہم لوگ بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ مجاز گرمی کی اس شام میں وہاں بیٹھ کر وہ لطف لیتے جو شاید اشوکا ہوٹل میں بھی لوگوں کو نہ آتا ہوگا۔ کوئی اگر پوچھتا کہ "مجاز کیا ہو رہا ہے"؟

تو وہ برجستہ کہتے "بھئی کیفے ڈی پھوس میں بیٹھے محقق ہو رہے ہیں"۔ اس میں کئی رعایتیں تھیں۔ مجاز حقے کی رعایت سے اپنے کو محقق کہا کرتے تھے اور "کیفے ڈی پھوس" اس لیے کہ بڈھے کی جھونپڑی پر پھوس پڑا ہوا تھا۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ نام مجاز مرحوم کا دیا ہوا ہے۔ دراصل اس زمانے میں شمشاد کی اسماعیلیہ بلڈنگ میں "کیفے ڈی جمیل" تھا۔ جس میں ابھی چند روز پہلے نواب صاحب کا "سیون اسٹار" تھا جو اب دواؤں کی دکان میں بدل گیا ہے۔ تو بھئی اس زمانے میں علی گڑھ میں 'کیفے ڈی جمیل' کی دھوم تھی لیکن مجاز مرحوم نے "کیفے ڈی پھوس" کو بھی چلا دیا تھا۔ پھر سن ۱۹۴۷ء میں جب آزادی کا زمانہ آیا ہمارے ہندستان

بن "اتھل پتھل" ہوگئی اور جب اس کے بعد یہ محفل پھر جمی تو "کیفے ڈی پھوس" کی مارکٹ ویلیو بھی بڑھ گئی تھی اور ممتاز ہاؤس کے داہنی طرف ڈاکخانے کے پیچھے ایک پکی عمارت نے یہ نام لے لیا اور اب تو اس نام کی خاصی قیمت ہے۔

ناموں کا معاملہ عجیب ہوتا ہے۔ اب یہی دیکھیے کہ جب نقوی پارک بن رہا تھا تو واقعہ یہ ہے کہ سید ابو طالب نقوی آئی سی ایس، نے اس میں غیر معمولی دلچسپی لی تھی۔ یہ وہی نقوی صاحب ہیں جو پاکستان بننے کے بعد کراچی چلے گئے۔ اور وہاں بااثر کمشنر تھے اور جنھوں نے سبز باغ دکھلا دکھلا کر جوش صاحب سے ہندستان چھڑوا دیا تھا۔ یہ نقوی صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ روزانہ صبح صبح ٹہلنے آتے۔ بیچوں بیچ ایک فوارہ بن گیا تھا باقی ہر طرف دھول ہی دھول تھی۔ یونیورسٹی کے لڑکے تو یوں بھی عادتاً یہاں آیا کرتے تھے، اس لیے کہ ٹہلنے کی اور کوئی جگہ نہ تھی۔ لیکن نقوی صاحب کے ہمت کی داد دینا پڑتی ہے کہ وہ اس وقت آج کے پارک کا تصور لے کر ٹہلا کرتے تھے جب پارک کی کچھ شکل نکل آئی تو ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کو خیال آیا کہ کیوں نہ حق شفعہ کے طور پر اسی پارک پر اپنا قبضہ جمایا جائے قبضے سے ان کی مراد یونیورسٹی کا کوئی توسیعی منصوبہ نہ تھا کہ اس زمین کو جارحانہ کارروائی کر کے ہڑپ کر لیا جائے بلکہ ان کا جذبہ بڑا مرنجاں مرنج قسم کا تھا۔ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ یہ پارک ان کے نام سے منسوب ہو جائے۔ اس زمانے میں لڑکے ذرا ان سے ناراض تھے۔

بات یہ تھی کہ مسلم لیگ کا عروج تھا۔ علی گڑھ میں جناح صاحب کا سالانہ دورہ ہوا کرتا تھا جسے لڑکے "جناح ویک" کہتے تھے۔ ان کا پروگرام ہفتے بھر رہتا تھا۔ خوب جلسے ہوا کرتے تھے۔ جناح صاحب کی آمد سے پہلے سر ضیاء الدین احمد نے کمانڈر انچیف سر آکنلک کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی تھی۔ اسی زمانے میں آکنلک نے کلکتہ میں کوئی بیان

دیا تھا جس سے نوجوان ناراض تھے وہ ان کا علی گڑھ آنا پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ لڑکوں نے امتحان کا عذر پیش کیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ایک دن جمعہ کی نماز پڑھ کر ڈاکٹر صاحب نکل رہے تھے۔ مسلم لیگی لڑکوں نے انھیں مسجد میں گھیر لیا اور گفتگو شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے کہا کہ "میں امتحان کو پندرہ دن کے لیے ملتوی کر دوں گا۔"

یہ زمانہ وہ تھا کہ امتحان کے ایک دن کے ملتوی ہونے کا کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کیونکہ امتحان کی تاریخیں اٹل ہوتی تھیں اور وہ ایک سال پہلے طے ہوتی تھیں۔ امتحان پندرہ روز کے لیے ملتوی ہو جائے یہ تو کوئی خواب میں بھی تصور نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ لڑکوں نے سوچا کہ اگر ایک دن میں پندرہ دن کا بھلا ہو تو کیا حرج ہے۔ اس خیال کے پیش نظر لڑکے آکنلک کی تقریر سننے کے لیے تیار ہو گئے لیکن جب کمانڈر ان چیف آئے تو لڑکے اپنے ہوش و حواس میں نہ رہے۔ چنانچہ جیسے ہی وہ اسٹریچی ہال میں داخل ہوئے اور اپنی کرسی پر بیٹھے، لڑکوں نے ان کے خلاف نعرے لگائے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین بہت چیخے چلائے، لیکن مجمع قابو میں نہ آیا آکنلک فوجی آدمی تھے۔ سیاست داں نہ تھے۔ مخالف نعرے برداشت کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ چنانچہ وہ لفٹ رائٹ کرتے ہوئے اسٹریچی ہال سے باہر چلے گئے۔ جلسہ درہم برہم ہو گیا۔ سر ضیاء الدین احمد ناراض ہو گئے، امتحان ملتوی نہیں ہوئے۔ اب تو لڑکوں کا غصہ اور بھڑک اٹھا۔ چند روز بعد "جناح ویک" شروع ہو گیا۔

جناح صاحب آئے اور جب انھیں اصل قصہ معلوم ہوا اور یہ پتا چلا کہ امتحان قریب ہے تو انھوں نے واپسی کا پروگرام بنا لیا اور لڑکوں سے کہا کہ "تم اپنے امتحان کی تیاری کرو میں پھر کبھی آؤں گا۔"

جناح صاحب علی گڑھ سے واپس چلے جائیں یہ کوئی تصور بھی نہ

کر سکتا تھا۔ لڑکوں نے کہا" امتحان تو پھر بھی دے لیں گے مگر جناح صاحب روز روز تھوڑا ہی آ سکتے ہیں۔ جناح صاحب کی واپسی گوارا نہیں ہے۔ دو روز یونیورسٹی میں بڑا ہنگامہ رہا۔ لڑکوں نے اصل بات تو چھوڑ دی ان کو اس بات پر غصہ تھا کہ سر ضیاء الدین مسجد میں وعدہ کر کے پلٹ گئے۔ اب مسئلہ امتحان کے ملتوی ہونے کا نہیں تھا جتنا مسجد میں وعدہ کر کے پلٹ جانے کا۔

بالآخر جناح صاحب نے ضیاء الدین احمد سے خود گفتگو کی۔ سر ضیاء الدین احمد کا کہنا تھا کہ لڑکوں نے آکنلک کے ساتھ بدتمیزی کی ہے اس لیے امتحان ملتوی نہیں ہوں گے۔

جناح صاحب برافروختہ ہو گئے" لڑکوں نے کیا بدتمیزی کی ؟"

سر ضیاء الدین احمد نے کہا" جناح صاحب آپ خود ہی سوچیے کہ کمانڈر ان چیف کے سامنے لڑکوں نے نعرے لگائے" ڈاؤن ود برٹش امپیریلزم"

جناح صاحب کے تیور بدل گئے" سر ضیاء الدین ! اگر یہ نعرہ بدتمیزی ہے تو سارا ہندستان یہ بدتمیزی کر رہا ہے۔ اب آپ دو کشتیوں میں سفر نہیں کر سکتے۔ آپ کو کشتی کا انتخاب کرنا ہوگا۔"

ڈاکٹر ضیاء الدین مصلحت اندیش تھے۔ انھیں انگریزوں سے مصلحت ہی کی بنا پر دلچسپی تھی اور آج وہ سمجھ گئے تھے کہ وقت بدل گیا ہے۔ چنانچہ وہ بھی بدل گئے انھوں نے اپنی مونچھ نیچی کر لی اور پھر" جناح ویک" بڑے شاندار طریقے سے منایا گیا۔ جس مصلحت اندیشی کی جناح صاحب کو سر ضیاء الدین سے شکایت تھی وہ ان سے بھی کسی حد تک وابستہ تھی۔

اسی دورے میں جناح صاحب یونین ہال میں ایک جلسے کو خطاب

کرکے نکلے اس کے بعد ہی انھیں شہر کی جامع مسجد کے ایک جلسے میں جانا تھا۔ وقت کی تنگی تھی۔ یہ طے ہوا کہ جناح صاحب یونین کے کمرے میں لباس تبدیل کر لیں۔ ان کے سکریٹری کار سے اٹیچی لے کر کپڑے نکالنے کمرے میں گئے اور کپڑے نکال کر اندر رکھ آئے۔ جب جناح صاحب کپڑے بدلنے کے لیے کمرے میں گئے تو فوراً سوٹ ہاتھ میں لیے ہوئے نکلے اور وہیں سے سکریٹری سے مخاطب ہوئے۔

"یہ کپڑا نہیں لیڈر والا کپڑا مانگتا ہے۔"

کچھ سمجھے کچھ نہ سمجھے، لیکن ان کے سکریٹری سمجھ گئے اور اس کے بعد جب وہ کپڑے پہن کر نکلے تو شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس تھے۔ اس وقت مسعود حسن بھی وہیں کھڑے تھے۔ مجھے مسعود صاحب کی مسکراہٹ اب بھی یاد ہے۔

جناح صاحب کی علی گڑھ میں پرستش ہوتی تھی۔ اس وقت قوم پرست طالب علموں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی اور استاذ کو گننے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ پاکستان بن گیا، جن کو وہاں جانا تھا چلے گئے۔ جنھوں نے ان لکیروں کو قسمت کی لکیر سمجھا۔ بہتوں نے چولا بدلا اور راتوں رات قوم پرست ہو گئے۔ اور جو پہلے سے تھے، ان کے دن بن آئے۔ اپنی تمام قوم پرستی کا آنا پائی سے حساب کیا۔ بعضوں نے تو اس پر سود در سود کا حساب لگا کر وصول کیا اور آزاد ہندستان کے خان بہادر بن گئے۔ کپڑوں کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ یہ انسان کے جسم کو چھپاتے ہیں لیکن پچھلے دنوں میں نے بہتوں کو ان کے خیالات ہی نہیں، اپنے اعمال چھپاتے بھی دیکھا ہے۔

میرا خیال ہے کہ جناح صاحب نے ہندستانی مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ لیکن مجھے یہ کبھی یقین نہ ہوا کہ وہ اپنے دل و دماغ سے

اسی میں دس کروڑ مسلمانوں کا مفاد بھی سمجھتے تھے۔ اس طرح وہ فرقہ پرست تھے لیکن ان پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ مسلمانوں میں کسی ایک مخصوص فرقہ کی مدد کرتے تھے یا صرف انھی کے مفاد کا خیال رکھتے تھے۔ ان کے ذہن میں دس کروڑ مسلمانوں کا مفاد تھا اور اس کے لیے وہ وکیل کی طرح لڑ رہے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ مقدمے کا فیصلہ تو مسلمانوں کے حق میں ہوا، لیکن اس کے نتیجے میں کتنے بچے یتیم اور کتنی عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ تاہم جناح صاحب کی نیت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

میں ایسے بہت سے قوم پرستوں کو جانتا ہوں جو اپنے آپ کو محض سیکولر ہی نہیں کہتے بلکہ ان کا بس چلے تو ساری قوم سے اپنی قوم پرستی کی قسمیں کھلوائیں۔ لیکن جب کبھی یہی قوم پرست یہی کھدر پوش کسی آزمائش میں پڑتے ہیں تو پہلی ترجیح اپنے عزیزوں کو دیتے ہیں اور اس کے بعد اگر سنّی ہیں تو سنّیوں کو اور اگر شیعہ ہیں تو شیعوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ عام طور پر ایسے قوم پرست حضرات اگر حکومت کے اہم تہذیبی اور تعلیمی اداروں پر بھی مقتدر کی حیثیت رکھتے ہیں تو صبح سے شام تک اپنے عزیزوں اور ہم فرقہ لوگوں کو ہی آگے بڑھاتے ہیں۔ کیسی ہے یہ قوم پرستی، جو ملمع کی طرح چڑھی ہوئی ہے۔ کسی کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نام نہیں لوں گا۔ لیکن میں چاہوں گا کہ ہمارے مقتدر حضرات اس میں اپنی شکل پہچانیں۔

وہ آدمی یقیناً عظیم ہے جو بنی نوع انسان سے ہمدردی رکھتا ہے اور ان کے کام آتا ہے۔

وہ آدمی اس کے بعد عظمت کو چھوتا ہے جو اپنی قوم کے کام آتا ہے۔

وہ آدمی اس سے کمتر ہے جو صرف اپنے فرقے کا خیال رکھے

ہے اور اسی کے کام آتا ہے۔

وہ آدمی گھٹیا ہے جو صرف اپنے رشتہ داروں کے کام آتا ہے، چاہے کھدّر کے کپڑے اور گاندھی ٹوپی پہنے۔

ہاں تو بات چلی تھی، ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد کی ــــ ان سے لڑکے ناراض تھے۔ اس لیے ڈاکٹر ضیاءالدین نے سوچا کہ اس پارک کا نام ضیاءالدین پارک ہو جائے تو لڑکوں نے اسے "سر سید پارک" کہنا شروع کر دیا۔ نقوی صاحب بہر حال آئی۔سی۔ ایس۔ تھے۔ اس وقت ہیلٹ یو۔پی کے گورنر تھے۔ چنانچہ سرکاری طور پر نقوی صاحب نے اس کا نام "ہیلٹ نقوی پارک" کروا دیا۔ ہیلٹ نقوی کچھ عجیب سا نام تھا۔ پھر یہ کہ ۴۲ء کے ہنگاموں کی وجہ سے ہیلٹ کے نام ہی سے لوگوں کے دلوں میں نفرت بیٹھ گئی تھی، اس لیے ہیلٹ کا نام اپنے آپ زبان سے گر گیا، اور یہ نقوی پارک ہو گیا۔ اور آج تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ پکارنے والوں میں سے عام طور پر لوگ یہ نہیں جانتے کہ نقوی صاحب کون تھے۔ وہ تو محض پارک کا نام سمجھتے ہیں۔

بات چلی تھی شمشاد اور یونیورسٹی کے ہوٹلوں کی اور ہو رہی تھی آزادی سے پہلے کی ــ اس زمانے کے ہوٹلوں کا انداز یہ تھا کہ پانچ آنے میں دو پیالی چائے اور برفی اور نمک پارے ملتے تھے۔ چائے کے معاملے میں صرف علی گڑھ کی یہ خصوصیت رہی تھی کہ چائے "پاٹ" میں آتی تھی اور ایک، پیالی کے سٹ میں دو پیالیاں بنتی تھیں اور اس کے بعد آپ دوبارہ بیرے سے کہہ کر 'پاٹ' میں اور پانی ڈلوا دیتے اور کچھ چائے کی پتی بھی۔ غرض آپ چاہیں تو ایک سیٹ کے چائے کے آرڈر میں جتنی پیالیاں چاہیں پی لیں، دام وہی ایک سیٹ کا ایک آنہ۔ لیکن سن ۵۰ء کے بعد یہ روایت ختم ہو گئی۔ البتہ کچھ دنوں تک حذبی صاحب کی ضد پر "الف لیلیٰ"، نے اس کو زندہ رکھا۔ "الف لیلیٰ" کا نام آیا تو اس کے بارے میں بھی سن لیجیے۔ یہ ریستوران

سن ۵۰ء کی دہائی میں تھا۔ اس کے بعد سے چل تو اب بھی رہا ہے لیکن اب نشان باقی ہے نام ختم ہوگیا۔ یہ یونین کے پاس ہے۔ دو کمرے اور سامنے میدان۔ جذبی صاحب، خلیل صاحب، قاضی عبدالستار، شہاب جعفری، شہریار، انور معظم، وغیرہ یہاں بیٹھتے۔ یہاں روشنی کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا۔ لیکن لوگ اطمینان سے بیٹھتے، ترقی پسند تحریک، حلقۂ ارباب ذوق، روس اور چین، فیض احمد فیض، سجاد ظہیر، جواہر لال نہرو ـــ وغیرہ وغیرہ۔ غرض مختلف موضوعات اور افراد پر باتیں ہوتیں۔ ایک بار رات زیادہ ہوگئی۔ لیکن باتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہو رہا تھا۔ جذبی صاحب نے اعلان کیا، "حضرات! میں آپ کو اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ پہلی بوند بارش کی پڑ چکی ہے لیکن آپ لوگوں کے سروں تک پہنچتے پہنچتے ذرا دیر لگے گی۔"

مجھے یاد نہیں، اس اندھیرے میں کس کی آواز آئی۔ شاید شہاب جعفری کی تھی "جذبی صاحب! چھَن سے جو آواز آئی تھی وہ تو ہم نے بھی سنی تھی۔"

جذبی صاحب نے اپنے صاف اور چکنے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان کے ساتھ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔

پھر "الف لیلیٰ" پر کسی کی نظر لگ گئی، اور یہ بزم تتر بتر ہوگئی۔ جذبی صاحب نے پھر شمشاد مارکٹ کا رخ کیا۔ پھر وہاں سے وہ تصویر محل کے لان میں آکر بیٹھنے لگے، یہاں امین اشرف، جاوید کمال اور نوری شاہ وغیرہ بھی آتے تھے۔ بڑی پُرفضا جگہ تھی۔ شام کو دھندلی دھندلی روشنی ایک خاص کیفیت پیدا کرتی تھی۔

جاوید کمال کا نام آیا تو میں لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دوں کہ میرا رشتہ اس شمشاد مارکٹ سے کیسے قائم ہوا۔

جاوید کمال رامپور کے پٹھان ہیں، شعر کہتے ہیں اور کینٹین چلاتے ہیں۔ چلانے کا لفظ میں جان بوجھ کر استعمال کرتا ہوں۔ جاوید کمال بڑے خوشگو شاعر ہیں

ان کی کینٹین ادیبوں اور شاعروں کا مرکز رہی ہے۔ ایک زمانے میں نوری شاہ، جذبی صاحب، انور معظم، شہاب جعفری، راہی معصوم رضا اور دوسرے حضرات بڑی پابندی سے یہاں آتے تھے اور یہاں ایسی گفتگو ہوا کرتی جیسی ایسی جگہوں پر ایسے لوگ عام طور پر کرتے ہیں۔ جاوید کمال نے بعض بڑے اچھے شعر کہے ہیں اس وقت ان کا ایک شعر یاد آ رہا ہے سہ

عمر بھر غم سے ہراساں نہ ہوئے تھے سو ہوئے
زندگی تجھ سے پشیماں نہ ہوئے تھے سو ہوئے

یہ بات اب سے بیس سال پہلے کی ہے۔ سن چھپن کی۔ میں جامعہ سے آیا تھا۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ علی گڑھ میں مکان ملنا آسان نہیں ہے جہاں کہیں زور جیسے بھی سر چھپانے کے لیے جگہ مل جائے قبضہ کر لو۔ پھر ذاکر صاحب جامعہ گئے تو وہ یہ سمجھے کہ مکان مل گیا ہے۔ بچوں کو اپنی گاڑی میں علی گڑھ لے آئے میرے لیے پریشانی تھی۔ میں نے چند روز کے لیے بچوں کو سیوہارے بھیج دیا اور اب مکان کی تلاش میں دن رات ایک کر دیا۔ وقتی طور پر 'امیر نشان' کے انسپکٹر مشرف نے سہارا دیا۔

انسپکٹر مشرف کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے۔ مشرف مرحوم ایک فرد نہیں بلکہ اپنی جگہ پر ایک "کالونی" تھے۔ ان کے پاس بیسوں مکان تھے۔ یہ سارے مکان "امیر نشان" کہلاتے تھے اور اب تو اس کے آس پاس کا علاقہ گرلز کالج سے دودھ پور کی سڑک تک "امیر نشان" کہلاتا ہے۔ مشرف مرحوم کا کوئی نہ کوئی مکان ضرور خالی رہتا تھا۔ کیوں کہ امیر نشان نام تھا کرایہ داروں کی مجبوری کا۔ جہاں انھیں دوسرا مکان ملا، فوراً اٹھ گئے۔ اس زمانے میں جذبی صاحب بھی ان کے ایک مکان میں رہتے تھے۔

مشرف مرحوم کے مزاج میں ذرا سی اذیت پسندی تھی وہ ذرا کنجوس تھے اس لیے پیسے کو اپنے دانتوں سے اس زور سے دباتے تھے

کہ اس میں دانتوں کی جگہ بن جاتی تھی اور پھر پیسہ پیسہ اٹک کر رہ جاتا تھا۔ ایک پھٹا ہوا بنیان، ایک تہمد پہن کر ایک ٹوٹے ہوئے مونڈھے پر بیٹھے رہتے اور جب اٹھتے تو اس کو اٹھوا کر احتیاط سے اندر رکھوا دیتے پیسے کے نام سے ان کی جان نکلتی تھی۔ ان کا اپنا بیٹا اسی کا شکار ہو گیا اس کو وہ چار آنے جیب خرچ دیتے تھے۔ اس نے آٹھ آنے کا مطالبہ کیا۔ امیر نشان کے لکھ پتی کے لیے آٹھ آنے روز بہت بڑی رقم تھی۔ چنانچہ وہ ناراض ہو کر فوج میں بھرتی ہو گیا۔ وہاں اس نے ایسا کشت و خون دیکھا کہ دماغ پر اس کا اثر ہو گیا۔

حکومت نے اسے علی گڑھ واپس بھیج دیا۔ وہ باپ جو چار آنے نہ خرچ کر سکتا ہو اس کے لیے دماغی مریض کا علاج تو بہت بڑی بات تھی۔ چنانچہ بیماری بڑھتی گئی اور اب وہ امیر نشان کی تمام عمارتوں کا وارث اس کے پھاٹک پر بھیک مانگتا نظر آتا ہے۔ آج بھی وہاں جائیں تو آپ کو یہ الوکھا فقیر اپنی مخصوص صدا لگاتا آئے گا۔ آپ دکانداروں سے اس کے بارے میں دریافت کر سکتے ہیں۔

یہ صورتِ حال بھی اس لیے ہے کہ مشرف مرحوم تکلیف پہنچا کر خوش ہوتے تھے۔ یونیورسٹی کے بہت سے اساتذہ مشرف مرحوم کے کرایہ دار رہ چکے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ وہاں بہت سے مصائب جھیل چکے ہیں۔ صبح کے وقت جب سب لوگ اپنے اپنے یہاں نہاتے ہوتے تو مشرف مرحوم کا یہ دلچسپ مشغلہ تھا کہ وہ ٹیوب ویل کا پانی بند کر دیتے۔ اور ہر گھر کے غسل خانے سے شور سنائی دیتا۔

ایک بار انسپکٹر مشرف مرحوم نے ایک کرایہ دار کو مشورہ دیا کہ صبح کے وقت ان کے لان میں دوڑا کریں۔ اس سے صحت اچھی ہوتی ہے وہ بیچارے اکھیں صورت سے درد آشنا سمجھے اور انھوں نے صبح صبح امیر نشان کے کوٹھی

والے لان میں دوڑ لگانی شروع کر دی۔ مشرف مرحوم کو احساس ہوا کہ جیسے ان کے لان کی گھاس گھس رہی ہے چنانچہ ایک روز ان کے پیچھے اپنا السیشین چھوڑ دیا۔ جب انھوں نے شکایت کی تو مرحوم نے کہا کہ "آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں کتے کی صحت بھی ان دنوں اچھی نہیں ہے۔ وہ بھی اگر آپ کے ساتھ اپنی صحت بنا لے تو آپ کا کیا نقصان ہے۔" وہ بیچارے اپنا سا منھ لے کر رہ گئے۔

امیر نشاں کی بے کیف زندگی مشرف مرحوم کی حرکات اور ان کی کنجوسی کے قصوں سے کبھی کبھی دلچسپ ہو جاتی تھی۔ منیب الرحمٰن وہیں رہتے تھے مشرف نے انھیں اپنی اس شاندار کوٹھی کا سب سے اچھا کمرہ دے رکھا تھا۔ وہ چاہتے تو اس کمرے کو بہت اچھے کرائے پر اٹھا سکتے تھے۔ لیکن منیب الرحمٰن کے والد نے رام پور میں مشرف کو کسی الجھے ہوئے مقدمے سے نجات دلائی تھی۔ اور اس احسان کا بدلہ چکانے کے لیے بقول خود انھوں نے منیب الرحمٰن کو یہ کمرہ دے دیا تھا۔ منیب الرحمٰن نے تواریخ میں ایم اے کر لیا تھا۔ اور اب وہ فارسی میں ایم اے کر رہے تھے۔ مشرف کو یہ شکایت تھی کہ آخر تعلیم کی بھی کوئی حد ہے۔ ایک مضمون میں ایم اے کر لیا اب ملازمت کی تلاش کرو۔ یہ کیا کہ ہر مضمون میں ایم اے کیا جائے۔ اور بلا وجہ کمرہ گھیرا جائے۔

مشرف کی کنجوسی کبھی کبھی ان کے لیے بلائے جان بن جاتی تھی۔ گرلز کالج کی لڑکیاں امیر نشاں میں سے ہو کر گزرا کرتی تھیں۔ کیوں کہ امیر نشاں کے چوراہے پر ہر قسم کے لوگ بیٹھا کرتے تھے۔ ایک روز حسب معمول لڑکیاں ان گزر رہی تھیں مشرف کے مالی نوکر نے ان کو روکا وہ نہ مانیں مشرف خود دوڑ پڑے۔ لڑکیوں نے اپنی چپل سے ان کی خوب تواضع کی۔ معاملہ پراکٹر آفس پہنچا اور پھر یہ قصہ لوگوں کی زبانوں پر رہ گیا۔

بہرحال جب میں علی گڑھ گیا۔ ۵ سال بعد آیا تو مشرف نے مجھے امیر نشاں میں ایک گوشہ دے دیا۔ لیکن اس مکان میں میں بیوی اور دو بچوں کے ساتھ

نہیں رہ سکتا تھا۔ مکان کا مسئلہ بدستور اپنی جگہ پر تھا۔ جاوید کمال سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے صابری صاحب کے پاس لے گئے۔ ان دنوں صابری صاحب شمشاد میں بڑی شان سے رونق افروز تھے۔ ان کے قبضے میں حامد علی بلڈنگ کی وہ دکان تھی جس میں اب یونیورسٹی کی اسٹیشنری کی دکان ہے۔ پچھلے حصے میں وہ خود رہتے تھے۔ جس میں اب صغیر صاحب رہتے ہیں۔ اوپر کے دونوں مکان ان کے قبضے میں تھے۔ جس میں اوپر والے حصے میں شو کمپنی کے مولانا عشرت رہتے تھے۔ اور سڑک کا سامنا کرنے والے حصے میں راقم الحروف کی قیام گاہ۔ یہ مکان مجھے کیسے ملا۔ یہ بھی ایک دلچسپ قصہ ہے۔ آپ بھی سنیے۔

اس قصے کو سنانے کے لیے صابری صاحب کے بارے میں بتانا ضروری ہے۔ صابری صاحب اپنی ذات سے انجمن تھے۔ بلکہ وہ تو اپنی ذات اور انجمن کو ہمیشہ برسرِ پیکار رکھتے تھے۔ شمشاد میں وہ ہر وقت شمشیر بکف نظر آتے۔ میں نے زندگی میں ایسے انسان نہیں دیکھے جیسے صابری صاحب تھے۔ ان کو اس بات پر بھی ناز تھا کہ وہ صابریہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شمشاد کے رہنے والوں سے انھیں یہ شکایت تھی کہ یہ لوگ معمولی خاندان کے تھے۔ اور ان سے بات کرنا اپنی زبان کو خراب کرنا تھا۔ یہاں وہ الگ تھلگ رہتے تھے۔ آن بان کے آدمی تھے۔ ہر شخص کی طرف حقارت سے دیکھتے۔ نفاست ان کی گھٹی میں تھی۔ نزاکت ان کی شخصیت کا نمایاں حصہ تھی۔ وہ ساٹن کا کلی دار پاجامہ پہنتے کیونکہ بقول ان کے لٹھے سے بدن چھلتا ہے۔ وہ ڈھاکے کی ململ کے کرتے پہنتے۔ جب بھی انھیں کسی چیز کا شوق پیدا ہوا، اس کام کو سیکھا اور اسے بلندیوں پر لے جاکر چھوڑ دیا۔ کہتے تھے کہ "پہلے مجھے بازار کا جوتا پہننے میں تکلیف ہوتی تھی تب مجھے ایک روز خیال پیدا ہوا کہ بازار کے جوتے حساب سے بنے ہوتے ہیں ناپ سے نہیں۔ چنانچہ دو ایک جوتا بنانے والوں کے پاس گیا۔ مگر انھوں نے مایوس کیا۔ پھر میں نے خود جوتے بنانے سیکھے۔ اور بالآخر جوتوں کا

کاروبار شروع کر دیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ صابری صاحب کی طرح جوتا بنانا ہر ایک کے بس کا کام نہیں تھا۔ لیکن ایک روز کیا ہوا کہ کسی گاہک سے ذرا سی بات پر ناراض ہو گئے اور سارا کاروبار ختم کر دیا۔ پھر ہوٹل کا کاروبار شروع کیا تو ایسا کہ لوگ رشک کرنے لگے۔ اس ریسٹورنٹ میں ہر چیز سلیقے سے ہوتی تھی۔ جس رنگ کے پردے ہوتے اسی رنگ کی کراکری ہوتی۔ جب شاہ سعود علی گڑھ آئے تو ان کی آمد پر ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کی طرف سے ایٹ ہوم کا انتظام کیا۔ سوال یہ تھا کہ اتنی بڑی دعوت کا انتظام کس کے سپرد کیا جائے جس میں تقریباً آٹھ دس ہزار مہمان ہوں گے۔ دلی کا کوئی ریسٹوراں اتنا بڑا انتظام کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ لوگوں نے صابری صاحب سے کہا۔ صابری صاحب کی غیرت یہ کیسے گوارا کرتی کہ وہ ذاکر صاحب سے درخواست کریں۔ حالانکہ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ شاہ سعود کے سامنے ہندستان اور مسلم یونیورسٹی کی سبکی ہو۔ ذاکر صاحب نے درخواست کی۔ صابری صاحب تیار ہو گئے۔ اور ایسا انتظام کیا کہ لوگ عش عش کرنے لگے۔ اکیس سال پہلے جن لوگوں نے اس تقریب میں شرکت کی ہے وہ اس شام کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ صابری نے نہ صرف ہندستان اور مسلم یونیورسٹی بلکہ شمشاد کی آبرو رکھ لی۔ شمشاد کا سر بلند ہو گیا تھا۔

لیکن ریسٹوراں کا کام بھی صابری صاحب نے بہت دن نہیں کیا۔ اور ایک روز انھوں نے ٹیلرنگ کا کام شروع کر دیا۔ میری جب ان سے ملاقات ہوئی تھی تو صابری صاحب پر کارِ خیر کا بھوت سوار تھا۔ اور انھوں نے مسلمان بچوں کو ٹیلرنگ کا کام سکھانا شروع کر دیا تھا۔

جاوید کمال بڑے خوش گو شاعر ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت میں غضب کا ڈراما ہے۔ انھوں نے بڑے ڈرامائی انداز میں مجھے پیش کیا۔ میرے خاندان کی بزرگی کی باتیں کیں۔ صابری صاحب متاثر ہو گئے۔ اور مجھے اوپر کا ایک

مکان دینے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن ایک شرط ہے۔

میں نے کہا" ایک نہیں چار شرطیں ماننے کے لیے تیار ہوں۔ آپ بس مجھے ٹکنے کے لیے ذرا سی جگہ دے دیجیے۔"

صابری صاحب بولے" شرط تو صرف ایک ہے۔ باقی باتیں معاملے کی ہیں۔ اور شرط بھی معمولی سی ہے۔ جس کو قبول کرنے میں نہ ہلدی لگے گی نہ پھٹکری ــــ اور نتیجہ آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ شرط یہ ہے کہ آپ شمشاد میں ایسے رہیں جیسے کنول پانی میں رہتا ہے۔ یہاں آپ کو کسی کے سلام کا جواب دیتے نہ دیکھوں اور اگر بالکل مجبوری ہو تو محض حقارت سے الٹی نظر ڈالیے۔ بس شمشاد کے مکینوں سے نہیں بلکہ کمینوں سے بچ کر رہیے۔"

اس کے بعد انھوں نے بارہ سو روپے پیشگی مانگے جو میں نے انھیں دے دیے اور مکان میں داخل ہو گیا۔

صابری صاحب میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور جب بہت خوش ہوتے تو کہتے " بھئی بڑے خاندانی آدمی ہو۔" یہی صابری صاحب کے خیال میں انسان کی معراج ہے۔ وہ اشرف المخلوقات میں صرف خاندانی آدمیوں ہی کو رکھتے تھے۔

ایک روز یہ خبر سنی کہ صابری صاحب شادی کرنے والے ہیں۔ صابری صاحب کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہو گی۔ ان کی بیوی بڑے زور و شور سے شادی کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی جیسے کوئی ماں اپنے بیٹے کے لیے کرتی ہے۔ صابری صاحب بہت خوش تھے۔ چند روز بعد معلوم ہوا کہ صابری صاحب بہت بیمار ہیں۔ میں دیکھنے گیا تو سارا بدن لہولہان تھا۔ وہ کھجاتے تھے اور کھجلی نہ ختم ہوتی تھی۔ معلوم ہوا کہ کشتہ کھا لیا۔ ان کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی لیکن صابری صاحب علاج صرف شفاء الملک حکیم عبداللطیف کا کر رہے تھے اور کسی حکیم ڈاکٹر کے قائل نہ تھے اور شفاء الملک سے بھی اس لیے متاثر نہیں تھے کہ

وہ طبیہ کالج کے پرنسپل تھے بلکہ اس لیے کہ ان کے دوست تھے۔ ایک روز مجھے بلوایا۔ رو رہے تھے اور... دیا نہیں جا رہا تھا۔ کبھی اپنے جسم کو دیکھتے اور کبھی اپنے ناخن کو۔۔۔۔ ایک پرہمدردی سے نظر ڈالتے اور دوسرے کی درندگی پر آنسو بھر لاتے۔ لیکن ان کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

صابری صاحب کو اس حالت میں دیکھنا مجھ جیسے اعصاب کے آدمی کا کام نہ تھا۔ بمشکل تمام ان کی زبان سے نکلا، پرویز صاحب! آج میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ دوا بھی منگوا سکوں۔ آپ کو نسخہ بھیج دیا کروں گا دوا منگوا دیجیے گا۔ اور دعا کیجیے کہ اچھا ہو جاؤں۔ پھر آپ کو ساری عمر ملازمت کی ضرورت نہ ہوگی۔ بس آپ شعر کہا کیجیے گا۔ میں کام کروں گا اور آپ کو کبھی کسی قسم کی پریشانی نہ ہوگی۔ مگر اس وقت بے دست و پا ہوں"۔ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ صابری صاحب پر یہ وقت بھی پڑ سکتا تھا۔ وہ آدمی جس کے جسم میں ہلکی سی لچک بھی نہ تھی وہ اس وقت بستر پر لوٹتا ہوا پڑا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ صابری صاحب نے لاکھوں کمائے اور اسی طرح انھیں خرچ بھی کیا۔ طوائفوں کے ناچ کے شوقین تھے۔ بے طرح روپیہ خرچ کرتے تھے کہتے تھے، مجھے ناچ سے اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنی اس بات سے کہ میں زمین پر نہیں، لوگوں کے سینوں پر رنڈی نچواتا ہوں۔ اور یہ لوگ اپنے گھروں میں داڑھیاں چبا رہے ہوتے ہیں۔"

چند روز بعد صابری صاحب کا انتقال ہو گیا۔ میں نے ان کی زندگی میں کبھی کسی کو ان کی تعریف کرتے نہیں سنا۔ ہر ایک ان کو برا بھلا کہتا اور صابری صاحب کو اس کی شکایت بھی نہیں تھی۔ وہ کہتے تھے میں ہی ان کے ساتھ کون سا اچھا سلوک کرتا ہوں جو ان سے امید کر لوں۔

صابری صاحب کا جنازہ شمشاد میں بڑے اہتمام سے اٹھا۔ شاید ہی پاس پڑوس کا کوئی ایسا آدمی ہو جو جنازے میں شریک نہ ہوا ہو۔ میں نے بہت سا

کم جنازے ایسے دیکھے ہیں۔ دفن کرنے کے بعد جب لوگ لوٹے ہیں تو صابری صاحب کی نیکیوں کے میں نے ایسے قصّے سُنے جو اس سے پہلے کبھی سننے میں نہیں آئے تھے۔ وہ شام شمشاد کی سنسان شام تھی، دلہن کی مانگ کی افشاں چھوٹ گئی تھی۔

صابری صاحب برسوں پہلے علی گڑھ آئے تھے اور شروع سے ایجوکیشنل کانفرنس کے مکانوں میں رہ رہے تھے۔ کسی بات پر ناراض ہو گئے اور ایک پائی کرایہ نہیں دیا۔ اور میں نے کبھی کسی کانفرنس کے کارکن کو تقاضے کرتے نہ دیکھا نہ سنا۔ ویسے تو غفور میاں کا حال یہ ہے کہ کسی پر دوسرے مہینے کا کرایہ واجب ہو جاتا ہے تو وہ راستہ دھول کر دیتے ہیں لیکن صابری صاحب سے ان کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وصول کریں۔ کانفرنس کے محاسب ابن علی ایسے معاملات میں بڑے چاق چوبند ہیں۔ انھوں نے کتنے نادہندوں سے روپے نکلوا لیے ہوں گے۔ ان کی آواز میں بلا کی گھن گرج ہے۔ وہ جب کانفرنس کے دفتر میں بولتے ہیں تو لالہ کی دکان تک آواز سنائی دیتی ہے۔ لیکن صابری صاحب کے زمانے میں میں نے کبھی ان کی آواز نہیں سُنی۔ شاید یہ بات ہو کہ میں اس وقت ان کی آواز سے نامانوس تھا۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ اپنے پچیس سالہ قیام کے دوران انھوں نے کبھی کرایہ نہیں دیا لیکن ان کی شان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

صابری صاحب کا انتقال ہو گیا لیکن پھر کانفرنس والوں نے مجھ سے بدلہ لیا۔ میں کرایہ دینے کو تیار تھا لیکن کانفرنس کے کارکن کرایہ لینے کے موڈ میں نہ تھے۔ کیوں کہ اُن کو اِن مکانوں سے کرایہ لینے کی عادت چھوٹ چکی تھی۔ غرض پولیس آئی۔ نوٹس بازی ہوئی۔ تھوڑی سی تو تو میں میں ہوئی۔ بالآخر کسی نے پروفیسر محمود حسین سے ذکر کر دیا۔ وہ یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ رجسٹرار تو خیر تھے ہی مگر میرے استاد بھی تھے۔ ان کا طوطی بول رہا تھا۔

انھوں نے زیدی صاحب کو بیچ میں ڈال کر یہ قصہ طے کیا۔ زیدی صاحب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے کے علاوہ کانفرنس کے صدر تھے۔

اس روز سے میں اس مکان میں عزت وآبرو سے رہ رہا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ پیشگی کے علاوہ بھی بڑی بہنوں کا کرایہ میں صابری صاحب کو دے چکا تھا۔ وہ بھی انھوں نے تسلیم نہیں کیا اور جس روز سے میں علی گڑھ کی سرزمین میں داخل ہوا تھا اس روز سے سارا کرایہ آنہ پائی سے وصول کر لیا۔ اس کے بعد تو کانفرنس کے قانونی مشیر اور میرے عزیز دوست، سید جرار حیدر اور ابن علی کی مہربانی سے سارے مسائل حل ہو گئے، اور میں شمشاد کا ایک جزو بن گیا۔ اس سے پہلے شمشاد مجھے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا ہر ایک مجھے اجنبی کے طور پر دیکھتا تھا۔ یہ شاید فطری بات بھی ہے کہ جب کوئی نیا مسافر ریل گاڑی کے ڈبے میں آتا ہے تو اس کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے وہی میرے ساتھ ہوا لیکن ایک بار جب میں ڈبے میں گھس گیا تو لوگوں نے بستر کھسکا کر میرے لیے جگہ کر دی اور ہمسفر اپنی نظریں بچھانے لگے۔ اور شمشاد میں ایسا گھل مل گیا کہ میں اور تو کا فرق مٹ گیا۔

ہاں تو اس طرح شمشاد کے بیس سال میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ میں نے یہاں بہت سرد وگرم دیکھے ہیں۔ یہاں میں نے لوگوں کو گلے ملتے بھی دیکھا ہے اور یہ بھی کہتے سنا ہے ؎

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

شمشاد کے مکین ان تمام ہنگاموں کے عادی ہیں۔ ہوٹل کے سامنے میز کرسی بچھی ہے باتیں ہو رہی ہیں، قہقہے لگ رہے ہیں۔ بیچ سڑک پر دوستوں کا مجمع ہے۔ مصافحے ہو رہے ہیں ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ ذرا سی دیر میں دیکھتے دیکھتے پستول نکل آتے۔ کبھی کبھی یہ پستول چل بھی جاتے ہیں۔ لیکن یہاں کے رہنے والوں کے کاروبار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جبار صاحب اور معشوق علی

اپنے گاہکوں کو اسی طرح چیزیں دیتے رہتے ہیں۔ قادر ذرا سر اٹھا کر دیکھ لیتے ہیں۔ ان لوگوں کے ماتھے پر ہلکا سا بل پڑ جاتا ہے۔ شاید ان کو خیال آجاتا ہے کہ جبار رضا کے لڑکے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کرتے تھے۔ اب ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ دنیا بدل گئی ہے۔ اب تو بہت سی ایسی باتیں ہو رہی ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ شاید جبّار صاحب نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا ہے اور وہ ان تمام اختلافات سے بے نیاز اپنی دکان سے سامان نکالتے اور خریداروں کو دیتے رہتے ہیں۔ جبار صاحب کو میں نے کیا شاید کسی نے کبھی اطمینان سے بیٹھے نہ دیکھا ہوگا۔ وہ رات کو دیر تک اپنے خریداروں کو سامان دیتے رہتے ہیں۔ ان کو اس کا خیال رہتا ہے کہ کہیں کسی کو تکلیف نہ ہو۔ شاپ انسپکٹر کبھی کبھی دیر تک دکان کھولنے پر ان کا چالان کر دیتے ہیں۔ وہ جرمانہ ادا کر دیتے ہیں۔ لیکن نہ تو ان کے ماتھے پر بل پڑتا ہے اور نہ ان کی دکان کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ وہ صبح صبح پھر آجاتے ہیں اگر انسپکٹر کے خوف سے دکان نہیں کھول پاتے تو بند دروازے کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ معشوق علی سے بات کرتے رہتے ہیں اور اپنے گاہکوں کو چوری چھپے نکال نکال کر سامان دیتے رہتے ہیں۔

جبّار صاحب نے کبھی اپنا سودا بلیک سے نہیں بیچا۔ خاص طور پر جب بجٹ آتا ہے اور عام دکاندار اسی روز شام کو ریڈیو سے سن کر ان اشیاء کے دام بڑھا دیتے ہیں جن پر ٹیکس کا اضافہ ہوا ہے تو جبار صاحب اپنے خریداروں کے گھر بلا طلب یہ چیزیں یہ کہہ کر بھیج دیتے ہیں کہ ان کے دام بڑھ گئے ہیں، میرے پاس پرانے داموں سے خرید ہے اس لیے رکھ لیجیے۔ اس کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ یہ سامان ان لوگوں کے گھر ضرور پہنچ جائے جو ان سے سامان قرض لیتے ہیں۔

جبار صاحب کی زندگی ندامتِ خلق میں گزر رہی ہے۔ ان میں ان

کے عزیز واقارب بھی شامل ہیں اور یونیورسٹی کے طالب علم اور اساتذہ بھی وہ اپنے روپوں کا کبھی تقاضا بھی نہیں کرتے بلکہ جب کوئی ان کو روپے دیتا ہے، حساب صاف کرتا ہے تو جبّار صاحب بڑے شرمندہ ہوتے ہیں جیسے کوئی گناہ کر رہے ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اتنی بڑی دکان چلانے کی بجائے دو تین سو روپے ماہانہ کی نوکری کرلیں تو زیادہ آرام سے رہ سکیں گے لیکن پھر وہ یہ خدمت کیسے انجام دیں گے۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ دکانوں پر تختیاں لگی رہتی ہیں جیسے "قرض مقراضِ محبت ہے" یا "قرض مانگ کر شرمندہ نہ کیجیے" یا "آج نقد کل ادھار"۔ شمشاد کی کسی دکان پر آپ کو ایسی تختیاں آویزاں نظر نہ آئیں گی۔ کیونکہ یہاں تو قرض تجدیدِ محبت ہے۔ یہاں اگر آپ کسی دکاندار کا حساب صاف کریں تو وہ یہی سمجھے گا کہ اب شاید محبت کا رشتہ منقطع ہو رہا ہے، اور آپ سے یہی پوچھے گا کہ آپ اس سے ناراض کیوں ہیں۔

پروفیسر مونس رضا ہی کی مثال لیجیے۔ آج کل جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی میں ہیں اس سے پہلے وہ کشمیر کے انجنیرنگ کالج کے پرنسپل تھے۔ ان کو علی گڑھ سے گئے برسوں گزر گئے ہیں۔ اس عرصے میں ایک پوری نسل جوان ہوگئی ہے۔ ان کی بیگم صاحبہ علی گڑھ میں ہی دلی منزل میں رہتی ہیں لیکن اگر وہ نہ بھی رہتیں تو بھی مونس رضا اسی شان سے آتے۔ بہرحال ماضی تمنائی کی بات نہیں۔ وہ برابر آتے رہتے ہیں اور جب وہ شمشاد سے گزرتے ہیں تو کسی کو خیال بھی نہیں ہوتا کہ اب وہ نئی دہلی میں رہتے ہیں۔ ان کو کسی دکان سے سگریٹ لیتے ہوئے دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک یہاں ان کی "ارتھمیٹک" چل رہی ہے۔ یوں تو وہ دہلی سے اپنی کار میں آتے ہیں لیکن شمشاد سے میں نے انھیں پیدل یا رکشا پر ہی گزرتے دیکھا ہے۔ وہ جب رکشے پر گزرتے ہیں اور دائیں بائیں دیکھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ کسی گھٹی ہوئی کال کوٹھری سے ابھی ابھی نکلے

ہیں اور اس کھلی ہوئی فضا میں سانس لیتے ہوئے ایک عجیب بے نام سی خوشی
محسوس کرتے ہیں۔ وہ جب لڑکوں کو بیچ سڑک پر کھڑے گلے ملتے ہوئے
دیکھتے ہیں تو انھیں ذرا بھی شکایت نہیں ہوتی کہ ان کے رکشے کو ذرا ہٹ کر
گزرنا پڑ رہا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ علی گڑھ ان لڑکوں کا گھر اور شمشاد ان
کا "ڈرائنگ روم کم ڈائننگ روم" ہے۔ مونس رضا اس انداز سے واقف ہیں
لیکن جو علی گڑھ کو نہیں جانتا اسے یہ بات کچھ عجیب سی لگتی ہے کہ سڑکیں، کاروں،
رکشاؤں اور دوسری گاڑیوں کے لیے ہوتی ہیں نہ کہ لوگوں سے گلے ملنے کے
لیے۔ لیکن علی گڑھ کے لڑکوں سے اگر کوئی یہ بات کہے تو ان کی سمجھ میں نہ آئے
گی کیونکہ شمشاد بہرحال شمشاد ہے جن پتھ نہیں۔

جبّار صاحب کے بالکل پاس لال داڑھی والے بوڑھے کی ترکاری کی دکان ہے
جو اب ترقی کرتے کرتے پنساری کا سامان بھی رکھنے لگا ہے۔ یہاں بھی ہمہ وقت بھیڑ
لگی رہتی ہے۔ جبار صاحب کے یہاں بھیڑ کی وجہ سے لوگوں کو سامان لینے میں دیر لگتی
ہے تو وہ سوچنے لگتے ہیں کہ لگے ہاتھوں یہاں سے بھی کچھ سامان لے لو۔ ایک پنتھ
دو کاج اسی کو کہتے ہیں۔

وہیں بغل میں بشیر کا ہوٹل اور ٹی ہاؤس ہے۔ یہ دونوں بڑے ہنگاموں
کے مرکز ہیں۔ یہ ایسے ملے جلے ہیں کہ ایک دوسرے کو کبھی کبھی پہچاننا مشکل ہو جاتا
ہے۔ لیکن ان کے بغیر شمشاد کی زندگی نامکمل ہے۔

"ٹی ہاؤس" پہلے میاں خاں کے بیٹے مستقیم احمد خاں کے قبضے میں تھا۔
اس کے کئی نام بدلے گئے لیکن میاں خاں کا دیا ہوا نام آج تک چل رہا ہے۔
اب مستقیم یونیورسٹی میں کام کرتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ نیکی، شرافت، سچائی اور
محنت نے انسانی شکل اختیار کر لی ہے اور اپنا نام مستقیم احمد خاں رکھ لیا ہے،
تو جن لوگوں کو ان سے سابقہ پڑ چکا ہے وہ میرے اس بیان کی تائید کریں گے۔
اب تو شمشاد کی نئی نسل کو شاید مستقیم کے پہچاننے میں تامل ہو لیکن اب سے

پندرہ بیس سال پہلے ان سے یہاں کا بچہ بچہ واقف تھا اب تو ان کا بیشتر وقت دفتر میں گزرتا ہے یا وہ طالب علموں کی تھیسس ٹائپ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں یا جے پی تیواری کی اسکیم کے تحت شہر میں یونیورسٹی کے استادوں کے لکچروں کا انتظام کرتے ہیں اور ان تمام باقاعدہ کاموں کے علاوہ دوستوں اور بزرگوں کی خدمت بھی کرتے ہیں یہ سعادت کچھ ان کے زور بازو کا نتیجہ ہے اور کچھ خدائے بخشندہ کی بخشش ہے۔

جہاں تک کہ میاں خاں کا معاملہ ہے ان سے علی گڑھ سے باہر بھی بہت سے لوگ واقف ہیں۔ خاص طور سے یونیورسٹیوں کے اساتذہ، جو کسی نہ کسی موقع پر یہاں آتے رہتے ہیں۔ میاں خاں شعبۂ اردو سے وابستہ رہے۔ وہ شعبہ کے ایک معمولی کارکن تھے۔ انھوں نے رشید صاحب کا زمانہ بھی دیکھا اور سرور صاحب کا دور بھی ــــ اگر شعبہ اردو کی تاریخ لکھی جائے تو شاید اس میں کچھ اساتذہ کے نام بھلے ہی نظر انداز ہو جائیں، دفتر میں کام کرنے والوں کا ذکر نہ آئے لیکن میاں خاں کا ذکر بار بار آئے گا۔ وہ شعبۂ اردو کے روح رواں تھے شعبے کے اساتذہ سے محبت بھی کرتے تھے اور عزت بھی۔ ان کی شخصیت بڑی ہمہ گیر ہے۔ انھوں نے شعبے کے تمام سرد و گرم دیکھے ہیں، لیکن ان کے کام کرنے کے انداز میں کبھی فرق نہیں آیا۔ وہ برابر اسی مستعدی سے کام کرتے رہے اور کبھی کسی کو احساس نہ ہونے دیا کہ ان کا اصل منصب کیا ہے۔ بڑے اہتمام سے چائے بناتے تھے۔ ہر شخص کی کمزوریوں کا خیال رکھتے تھے۔ اگر کبھی گرین لیبل چائے نہ مل سکی اور کسی معمولی سی چائے کی پتی پر انھیں قناعت کرنا پڑی تو وہ اپنی مسکراہٹ اور شرمندگی سے اس کی تلافی کر دیا کرتے تھے۔ وہ دفتر کے کلرک کے دست راست تھے اور ضروری مشورے دیا کرتے تھے اور شعبہ کی عزت و آبرو کا ہمیشہ پاس رکھتے تھے۔ وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتا جب وہ ریٹائر ہوئے۔ ریٹائر کیا ہوئے سبکدوش ہوئے، تو ان کے چہرے سے ذمہ داری سے عہدہ برآ

ہونے کا احساس تو تھا ہی، پر یہ اطمینان تھا کہ انھوں نے کسی کا دل نہیں دکھایا یہ اتنی بڑی بات ہے، خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن ان کی آنکھیں ضرور پُرنم تھیں۔ شعبہ اردو پر آج بھی ان کا قرض واجب ہے۔ وہ چُپ چاپ خاموشی سے شعبے ایک ایک استاد سے گلے مل کر رخصت ہو گئے۔ ان کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ وہ خاموشی سے چلے گئے اور ہم سب دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے۔

میرے قلم میں اتنی سکت نہیں نہ میں ان کی شخصیت کو صحیح طور پر پیش کر سکتا ہوں۔ وہ رشید صاحب کے میدان کے آدمی ہیں۔ رشید ہی صاحب ان کی شخصیت کو قلم بند کر سکتے ہیں۔ میں ان کی سرحد میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ اگر رشید صاحب میاں خاں پر قلم اٹھائیں گے تو اردو ادب میں ایک اور کندن کا اضافہ ہوگا۔

ہاں تو میاں صاحب دن کو شعبہ اردو میں کام کرتے تھے اور شام کو شمشاد میں اپنی کباب کی دکان لگاتے۔ یہ دکان شمشاد کی شخصیت میں بالکل گھل مل گئی تھی۔ یہاں کوئی سجاوٹ نہیں تھی۔ ایک تخت تھا چند اینٹیں تھیں، وہ طشتہ بھر کر قیمہ لاتے۔ اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں سارے کباب بک جاتے۔ ان کے کبابوں کا ایک خاص ذائقہ تھا جس پر علی گڑھ کے لوگ جان چھڑکتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میاں خاں کہیں اور کباب بناتے تو اتنے ذائقہ دار نہ ہوتے۔ ان کبابوں کے ذائقہ میں تو شمشاد کی مٹی کا بڑا ہاتھ تھا۔ اور یہ سعادت کہیں اور حاصل بھی نہیں ہو سکتی۔ میاں خاں نے پچھلے دنوں اپنی دکان بڑھا دی اب وہ دور چلے گئے ہیں۔ انھوں نے لکڑی کی ایک ٹال جمال پور میں رکھ لی ہے اور میاں خاں کی جگہ شمشاد میں کوئی اور کباب بناتا ہے۔ سب کچھ وہی ہے۔ وہی گوشت وہی مسالا ـــــ وہی شمشاد کی سرزمین ـــــ لیکن کبابوں میں وہ ذائقہ نہیں۔ پروفیسر خورشید الاسلام کو جب ان کے کبابوں کا ذائقہ ستاتا ہے تو وہ میاں خاں کو ولی منزل بلوا

لیتے ہیں اور میاں خاں بڑی خوشی سے وہیں کباب بناتے ہیں اور وہاں سب کو کھلا کر خوش ہوتے ہیں۔ میں ان لوگوں پر افسوس کرتا ہوں جو میاں خاں سے نہیں ملے۔ انھوں نے میاں خاں کے ہاتھ کی چائے نہیں پی۔ ان کے بنائے ہوئے کباب نہیں کھائے۔ شمشاد میں ان کی ایک جگہ ہے اور آج بھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میاں خاں بیٹھے کباب بنا رہے ہیں۔

یہیں پیچھے بہادر کی پان کی دکان ہے۔ بہادر اپنے پان کے لیے اسی طرح مشہور رہیں جیسے میاں خاں اپنے کباب کے لیے۔ فرق یہ ہے کہ کباب ایک قسم کے ہوتے ہیں لیکن پانوں میں مذاق مذاق کا فرق ہے۔ بہادر کے یہاں سیکڑوں آدمی روزانہ پان کھاتے ہیں۔ بہادر کو معلوم ہے کہ کون چونا کم کھاتا ہے کون زیادہ — کون سادہ پان کھاتا ہے کون میٹھا اور کون لکھنؤ کے زردے کا — وہ کبھی کسی سے پوچھتے نہیں اور ویسا ہی پان بنا کر دیتے ہیں جیسا وہ کھاتا ہے۔ ان کو اتنی فرصت بھی نہیں۔ اگر پان بنانے کی کوئی مشین ہوتی تو وہ بھی اتنا تیز پان نہیں بنا سکتی تھی جتنا کہ بہادر کے ہاتھ بناتے ہیں۔ میں ایک بار ڈھائی تین سال بعد ان کی دکان پر گیا لیکن بہادر نے اسی محبت اور خندہ پیشانی سے میرے ذائقہ کا پان بنا دیا۔ وہ اپنے کام میں مردم شناس ہیں۔ بہادر کے ہاتھ ہمیشہ سرخ رہتے ہیں کبھی کبھی ان کے ہاتھوں کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاید یہی ان کا رنگ ہو۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ عرب کے سمندروں کا پانی بھی ان کو صاف نہیں کر سکتا۔

پان کھانے کی عادت بھی خاندانی ہوتی ہے پہلے تو اسے تہذیب کی علامت سمجھا جاتا تھا، اب بھی دیکھیے ناکہ لکھنؤ والوں نے اتنی نفاست پیدا کر لی ہے کہ پان کی تھالی میں کٹوریاں رکھ کر دیں گے کیونکہ کھلایا ن تو دشمن کو دیا جاتا ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ دشمن کو پان دینے کا کیا موقع — بھائی اگر کسی کا دشمن گھر پہ آجائے تو اس کی بھی خاطر مدارات تو ہونی ہی چاہیے۔ اب

ایسی صورت میں اس کے سامنے گلوری پیش کی جائے تو شبہ ہو سکتا ہے کہ اس میں "کچھ" ڈال کر تو گلوری نہیں بنائی گئی ہے۔ اس لیے لکھنؤ والوں نے اپنی تہذیب میں اسے بھی شامل کر لیا ہے کہ کھلا پان دشمن کو پیش کیا جاتا ہے۔ گھر کی بیبیاں بیڑا بناتے وقت اس کا خاص طور پر خیال رکھتی ہیں کہ کوئی بیڑا یا گلوری کھلنے نہ پائے ورنہ گھر آیا مہمان بُرا مان سکتا ہے۔ کہ ہم تو محبت سے آئے اور ہم کو دشمن سمجھا گیا۔

پان بہت دنوں تک ہماری مشرقی تہذیب کی علامت بنا رہا۔ میں بیس بائیس سال پہلے جامعہ میں تھا اس وقت نہ صدیقہ پان کھاتی تھیں اور نہ میں۔ مہمان کی خاطر نئے زمانے کے اعتبار سے چائے سے ہوتی تھی۔ ایک بار میرے چچا وہاں آئے۔ ان کے لیے پاندان کا انتظام اور اہتمام کیا گیا۔ ہرچند کہ وہ بہت تھوڑے دنوں رہے لیکن انھوں نے جان بوجھ کر پان کھانے کی عادت ڈال دی اور ہدایت کی کہ "یہ پاندان سرسبز رہے۔" بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہمارے گھر سے کوئی سرخرو نہ نکلے۔ چائے سے تو رہا سہا پان کا رنگ بھی صاف ہو جاتا ہے۔ ع برگ سبز است تحفۂ درویش۔

چنانچہ وہ دن ہے اور آج کا دن، یہ پاندان نہ صرف شمشاد تک پہنچا بلکہ یہ سمندر پار موریشس تک ہمارا ساتھ دے رہا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ دور دور سے لوگ ہمارے پان کی شہرت سن کر کھانے آتے ہیں اور اب مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ بنگلا دیش بننے کے بعد پاکستان کے پان کھانے والوں پر کیا بیت گئی تھی۔ اردو کے مشہور شاعر جناب بیکل اتساہی جب پچھلے دنوں موریشس آئے تھے تو پان کی طلب انھیں بار بار میرے گھر کھینچ لایا کرتی تھی۔

ہاں تو پان کی بات بہادر کی دکان سے چلی تھی۔ یہ سچ ہے کہ بہادر

کے بغیر شمشاد کی صحیح تصویر نہیں اُبھرتی۔ میں اس لیے بھی نہیں سوچ سکتا کہ پچھلے بیس سال سے میں انھیں ایک ہی پہلو سے بیٹھے دیکھ رہا ہوں۔ دیکھیے یہ دوسرا پہلو کب بدلتے ہیں۔

یہ سب دکانیں وہ ہیں کہ علی گڑھ سے باہر کے لوگ ان کو دکان ماننے کے لیئے تیار نہ ہوں گے۔ لیکن علی گڑھ کے لوگ بڑے قناعت پسند ہیں۔ وہ اپنی پرانے ڈھرّے والی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں لانا چاہتے۔ میں سوچتا ہوں کہ شاید سرسید کے زمانے میں بھی یہ جگہ ایسی ہی اور یہی دکانیں ہوں۔ جبار رضا صاحب میاں خاںؒ بہادر اور دوسرے تمام دکاندار ــــ ایسا لگتا ہے کہ یہ سب اسی زمانے سے چلے آرہے ہیں۔

کرنل بشیر حسین زیدی جب وائس چانسلر ہو کر آئے تو کچھ ہی دنوں بعد میں نے صابری صاحب سے پوچھا ــ "صابری صاحب! آپ کا زیدی صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے" صابری صاحب مسکرائے اور بولے "میاں! مجھ سے کیا پوچھتے ہو، خود دیکھ لینا۔ ذاکر میاں بڑے طمطراق سے آئے تھے۔ بڑا شور سنتے تھے ــ ہاں کچھ کام بھی کیا اور یونیورسٹی بچ گئی۔ لیکن اب تو ان کے رکھے ہوئے گملے نظر آرہے ہیں۔ دیکھیے یہ پھول بھی کتنے دنوں اور کھلے رہتے ہیں اور اب سنا ہے کہ زیدی صاحب کچھ ناپ تول کر وا رہے ہیں، کچھ گڈھوں کی قطاریں کھُد رہی ہیں۔ دو چار میں اینٹ بھروا دیں گے۔ آگے اللہ مالک ہے"۔

یہ جملے انھوں نے اس آدمی کے بارے میں کہے تھے جس کو علی گڑھ والے اپنا شاہجہاں کہتے ہیں۔ علی گڑھ کے نشاۃ الثانیہ میں زیدی صاحب کے آنے کے بعد ہی تعمیر کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کے زمانے میں آزاد لائبریری، کینڈی ہاؤس، آرٹس فیکلٹی، وائس چانسلرس لاج، اسٹاف کلب، ویمنس کالج کی نئی عمارت، انجینرنگ کالج اور پالی ٹکنیک کی

نئی عمارتیں، ڈیفنس پالی ٹکنیک، فزکس ڈیپارٹمنٹ اور متعدد ہوسٹل تعمیر ہوئے اور میڈیکل کالج کی تعمیر کا کام بھی شروع ہو گیا تھا۔ یہ بات مشہور تھی کہ جس راستے سے زیدی صاحب کی گاڑی گزر جاتی تھی اگلے روز وہاں پیمائش کا کام شروع ہونے لگتا تھا۔ غرض اس علی گڑھ کی مٹی میں زیدی صاحب اپنی زندگی کے بہترین لمحات ہی نہیں بلکہ اپنی سب سے قیمتی شے رکھ کر چلے گئے۔

ہاں تو زیدی صاحب کے دماغ میں یہ بات بھی آئی کہ شمشاد مارکٹ کی ازسرِ نو تعمیر کی جائے۔ شمشاد احمد خاں کے ورثا سے یونیورسٹی زمین لے کر ایک سہ منزلہ بلڈنگ کی تعمیر کرے۔ جو چوراہے سے لے کر لکڑیوں کی ٹال تک جائے۔ نیچے دکانیں ہوں اور اوپر ریستوران اور رہائشی کمرے۔ گویا جنھیں شمشاد والے دکانیں کہتے ہیں انھیں ڈھا دیا جائے۔ اور ایک جدید قسم کی عمارت تعمیر کی جائے اور پھر مارکٹ بنے جو یونیورسٹی کے شایانِ شان ہو۔

لیکن پھر یہ تجویز تجویز کی منزل سے آگے نہیں بڑھی۔ اور زیدی صاحب نے پھر اس کا ذکر بھی کسی سے نہیں کیا۔ اب بھی جب لوگ اس مسئلہ پر بات کرتے ہیں تو سننے میں آتا ہے کہ آفتاب منزل والوں نے زمین بیچنے سے انکار کر دیا۔ کچھ کہتے ہیں کہ زیدی صاحب خود بھی اس کی تعمیر میں خرابی کی ایک صورت دیکھ رہے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ ایک بڑا شاندار بازار بن جاتا۔ ایسا لگتا کہ جیسا کناٹ سرکس کا ایک ونگ، شمشاد کی باہوں سے آکر لگ گیا ہے۔ تمام دکانیں الگ الگ ہو کر محفوظ ہو جاتیں۔ چوکیدار کے پہرے کی ضرورت نہ رہتی۔ غرض ایک نیا بازار ہوتا۔ لیکن پھر وہ شمشاد نہ ہوتا۔ آپ ایسا بازار نئی دہلی میں دیکھ سکتے ہیں بمبئی میں دیکھ سکتے ہیں۔ ہندستان کے ہر بڑے شہر میں دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن شمشاد مارکٹ دیکھنے

کے لیے آپ کو علی گڑھ جانا ہوگا۔ دراصل یہ جدید اور قدیم کا مسئلہ نہیں ہے یہ صفائی اور گندگی کے درمیان انتخاب کا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ یہ مسئلہ ہے تہذیبی یک جہتی کا۔

اس نئی عمارت کی تعمیر سے قومی یک جہتی خطرے میں پڑ جاتی۔ الگ الگ دکانیں ہوتیں جو آج ایک ہیں۔ شمشاد میں اسی وجہ سے "تو، من و تو" کا فرق نہیں ہے۔

بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ اس بازار میں مذہب و ملت کا باقاعدہ سوال ہے۔ بقول ایک سیاست داں کے مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے۔ لیکن یہاں آپ کو ہندو دکاندار بھی نظر آئیں گے، شرما جی کی کیمرہ کرافٹ، راما بکڈپو، سنگھل نیوز ایجنسی —— یہ دکانیں برباد بھی ہوئیں اور پھر اپنی جگہ پر کھڑی بھی ہوگئیں۔ یہ دکانیں اس تہذیب کا حصہ ہیں۔ یہ شمشاد میں لہو لٹے کا کام کرتی ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ راما اور سنگھل اس لیے بھی ضروری ہے کہ نوری شاہ کو رات کو نیند کیسے آئے گی۔ اس لیے کہ جب تک کوئی نئی چیز نہ پڑھ لیں، کیسے سو سکیں گے۔ وہ نئی کتابیں حاصل کرنے کہاں جائیں گے۔ ان کی راتیں ویران ہو جائیں گی۔ روزانہ ذرا سی دیر کو وہ اپنی سائیکل سامنے کھڑی کرتے ہیں اور راما کی دکان میں کچھ ٹٹولتے نظر آتے ہیں۔ مجھے جب بھی اپنے ٹیلی وژن کے علاج کے سلسلے میں نوری شاہ کی ضرورت محسوس ہوئی میں نے شام کو راما کی دکان پر پہرا لگا دیا اور نوری شاہ کشاں کشاں چلے آئے۔

نوری شاہ کا تعلق شمشاد سے خاصا گہرا ہے۔ اگر وہ روزانہ شمشاد نہ آئیں تو مجھے یقین ہے کہ ان کی بھوک کم ہو جائے گی، اور ان کا کھانا ہضم نہ ہوگا۔ آپ انھیں بلا ناغہ شام کو مکتبہ جامعہ میں بزمی صاحب منظور ہاشمی صاحب اور چند دوسرے نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی صحبت

میں دیکھ سکتے ہیں۔ خود بہت اچھے افسانہ نگار ہیں، شعر و ادب میں نئے پن کو تلاش کرتے ہیں۔ اگرچہ نوری شاہ سائنس کے استاد ہیں۔ لیکن ادب کے میدان میں بھی ان کا مطالعہ خاصا وسیع ہے نہ صرف اردو بلکہ انگریزی کی ادبیات کی کتابیں اور رسالے بڑے شوق اور پابندی سے پڑھتے ہیں۔

شام کو اگر وہ کہیں اور نکل جائیں تو پیپل کے پیڑ کے نیچے آپ کو سناٹا محسوس ہوگا۔ یہ اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو افغانستان سے جلاوطن کر دیا گیا تھا اور ہندستان میں بس گیا تھا۔ لیکن اب تو یوں سمجھئے کہ یہیں کے ہو کے رہ گئے ہیں کہ اب ایسے ہی کسی موقع پر ان کے بزرگوں کے وطن کا خیال آتا ہے۔ بزمی صاحب کی بزم میں نوری صاحب کی بدولت بڑی رونق ہے۔

بزمی صاحب کی دکان سے ملا ہوا ادکے ہیئر ڈریسنگ سیلون ہے۔ اس کے شاندار ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ یہ سیلون نئی دہلی کے کناٹ سرکس میں کہیں ہو تو اس کی اجنبیت کا ذرا سا بھی احساس نہ ہو۔ لیکن شمشاد میں ضرور بے جوڑ سا ہے۔ جیسے ٹاٹ میں کوئی مخمل کا پیوند لگا دے۔ یہ دکان پہلے امین صاحب کے قبضے میں تھی۔ اس وقت کچھ حجامت کا سامان تھا، کچھ تیلوں کی بوتلیں، اور آمنے سامنے دو آئینے یہ اس دکان کا سرمایہ تھا جس میں باپ بیٹے کام کرتے تھے۔ تیسرے آدمی کی حیثیت روح القدس کی سی تھی جو کبھی نظر آتا کبھی نہیں۔ ہاں ایک کونے میں مس گجن کی تصویر تھی۔ مس گجن چالیس برس پہلے کی ایک ایکٹرس تھی۔ جانکی بائی چھپن چھری کے عہد کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فلموں میں پہلے پہل آواز سنائی دی تھی۔ مس گجن کو اس زمانے میں وہی حیثیت حاصل تھی جو اس زمانے میں مینا کماری، یا جیہ بھادری یا شرمیلا ٹیگور کو ہے۔

آج بھی مس گجن کا نام کسی بڑے بوڑھے کے سامنے لے لیا جائے

تو مجھے یقین ہے کہ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگےگا۔ اور اسے "عشرت فانی" کے دن یاد آجائیں گے۔ امین صاحب کی دکان میں خاتون مشرق کا ایک بہت پرانا رسالہ تھا جس پر اتنے نشان تھے کہ ورق کے کونوں کے پاس کے الفاظ پڑھے نہ جاتے تھے۔ نہ جانے کتنے ہزار آدمیوں نے اپنی حجامت سے پہلے تھوک لگا لگا کر ان کی ورق گردانی کی تھی۔ ایک انگریزی رسالہ السٹریٹڈ ویکلی کا بھی بہت پرانا پرچہ وہاں پڑا تھا اس کا ٹائیٹل پھٹ چکا تھا اس کے علاوہ بہت سے صفحات الگ ہو چکے تھے اور جو باقی تھے وہ بھی تیار بیٹھے تھے کہ کوئی ہاتھ میں لے اور وہ نکلیں۔ گریٹا گاربو کی ایک چھوٹی سی تصویر بھی اس میں تھی اور غالباً یہی دیکھنے والوں کا مرکز رہی ہوگی کیونکہ عام طور پر وہی صفحہ کھلا رہتا تھا۔

شمشاد اور امین صاحب ایک دوسرے سے وابستہ تھے۔ ان کا وطن تورام پور تھا لیکن شمشاد میں وہ گویا صدیوں سے رہ رہے تھے اور اس کا اندازہ ہر اس شخص کو تھا جو ان کے سامنے سر تسلیم خم کرتا تھا کہ وہ اپنا کام شروع کریں۔ کام تو وہ کرتے تھے اور بڑے دھیان سے کرتے تھے لیکن کبھی کبھی ان کی قینچی کی آواز رک جاتی اور وہ کنگھا روک کر کہتے ــــ "میاں کیا وقت بدل چکا ہے۔ یہ علی گڑھ بھی کیا جگہ ہے۔ یہاں کسی چیز کو قیام نہیں۔ اب دیکھیے زمانہ گزر گیا لیکن ایسا لگتا ہے کہ کل کی بات تھی کہ ایوب خاں اسی کرسی پر بیٹھ کر بال بنوا رہے تھے۔ بڑے باغ و بہار آدمی تھے کیا کہنا ــــ مجھے اس وقت ایسا لگا کہ آپ نہیں ایوب خاں بیٹھے ہیں ــــ وہی ایوب خاں جو اب پاکستان کے صدر ہیں ــــ اور ہاں رفیع صاحب ــــ وہی بارہ بنکی مسولی والے قدوائی صاحب ــــ کیا آدمی تھے ــــ میں تو یہی خدمت کر سکتا تھا اور کرتا تھا۔ اس کے آگے مجھے کچھ نہیں معلوم ــــ لیکن یہ سچ ہے کہ وہ زمانے لد گئے۔ جب ایک سے

ایک خاندانی اسمٰعیل گڑھ میں آتے تھے اور اب تو چار چوڑے پڑھنے لگے ہیں۔کیا زمانہ آیا ہے۔یہ لوگ وہ تھے جو کبھی نہیں پوچھتے تھے کہ تمھارے کتنے پیسے ہوئے وہ تو بس جیب میں ہاتھ ڈالتے اور جو کچھ ہوا سب نکال کر ہاتھ پر رکھدیا اور چل دیے، مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے اور ایک آج کے لڑکے ہیں۔ بس حضور بس۔منھ نہ کھلوائیے۔"

یہ کہا اور اپنا کام شروع کر دیا۔ چھ سات سال پہلے کوئی حادثہ ہوا اس میں ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔بس رام پور چلے گئے۔ایک بار درمیان میں آئے تھے۔ دکان کے سامنے بیٹھے ہوئے شمشاد کو حسرت سے دیکھا کرتے تھے۔اپنے بیٹے کی اس شاندار دکان سے مجھے یقین ہے کہ انھیں کوئی خوشی نہ ہوئی ہوگی۔کیونکہ ان کا بنایا ہوا نقشہ بدل گیا تھا۔کچن کی تصویر نظر نہیں آتی تھی۔شاید اپنے ساتھ رامپور لے گئے ہوں۔حسن کا مذاق بھی بدل گیا۔وہ تو یہی سوچتے ہوں گے کہ یہ نائی کی دکان ہے یا آئینہ خانہ۔

شمشاد کے لڑکے ان کو امین نائی کہتے تھے۔وہ اس ترکیب سے خوش نہیں تھے کیونکہ نائی ان کا نام نہیں پیشہ ہے اور نام کے ساتھ پیشے کا ذکر ہر وقت کچھ اچھا بھی نہیں لگتا۔چنانچہ میرے بیٹے سے کہا کرتے تھے" صاحبزادے! تم شریف آدمی کے لڑکے ہو امین صاحب یا امین بھائی کہا کرو۔کبھی تم نے اپنے والد کو بھی اس طرح نام لیتے سنا ہے؟ نائی کا لفظ تمھارے منہ سے اچھا نہیں لگتا"لیکن یہ بدنصیب نائی کا لفظ ان کے نام سے اتنا چپک گیا تھا کہ محلے کے اکثر بچوں کو اس کے گوند کو چھڑاتے دیکھا۔ وہ نکل تو جاتا تھا لیکن پھر اسی طرح چپک جاتا تھا۔

امین صاحب نے سر میں لگانے کا ایک تیل تیار کیا تھا جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ گنجے سر میں بال اُگ آئیں گے کہتے تھے کہ ایک خاندانی نسخے سے تیار کیا گیا ہے۔ اگر اشتہار ۔۔۔ ان کی ۔۔۔ نہ ہوتی

تو لوگ اس کی قدر کرتے اور دور دور سے لینے آتے لیکن اب تو یہ صورت تھی کہ خود ہی ہماشما کے یہاں زبردستی دے آتے۔ یہ تیل میرے گھر بھی اکثر پہنچایا کرتے تھے۔ بچے منع کرتے کہ ضرورت نہیں ہے لیکن وہ نہ مانتے تھے، ان سے یہی کہتے کہ "تم تو اسے رکھ لو۔ روپے سے تمہیں کیا مطلب۔ اس کا حساب تو میں پروفیسر صاحب سے کر لوں گا تم بس سر میں لگاؤ۔"

اور حقیقت یہ ہے کہ میں کبھی سوا روپے کے لیے ان سے کیا کہتا۔ بلکہ جب قیمت ادا کرتا تو ان کا شکریہ ادا کرتا۔ اور اس اضافی زحمت کے لیے معذرت طلب کرتا۔

امین صاحب شمشاد کی نبض کو خوب پہچانتے تھے۔ وہ شمشاد کا چلتا پھرتا گزٹ تھے۔ ان کی خبر رساں ایجنسی ہر چیز وقت پر پہنچا دیتی تھی چاہے وہ ہند پاک جنگ ہو یا فرقہ وارانہ فساد۔ ان کے پاس ہر وقت خبر موجود رہتی تھی اور اس زمانے میں انھیں اپنے کام سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہوتی تھی اس وقت ان کا گاہک بال بنوانے والا نہ ہوتا تھا۔ وہ تو خبریں سننے والے کی فکر میں شمشاد میں اپنی دکان کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے۔ بس کوئی سلام کر لے ان کا ریڈیو چل پڑا۔ یہ بھی سچ ہے کہ شمشاد میں حقیقت سے زیادہ افواہوں کو اہمیت حاصل ہے۔ یہاں وہ اخبار زیادہ شوق سے پڑھا جاتا ہے جس میں واقعات پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا جہاں قیاس آرائیوں کو اہمیت حاصل ہے۔ اسی لیے یہاں پر یونیورسٹی کے اساتذہ مستعد نہیں سمجھے جاتے بلکہ یہاں کی تہذیبی زندگی میں گھروں میں کام کرنے والے نوکروں اور یونیورسٹی کے بیروں کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ لاؤڈ اسپیکر کے اعلانات کو کوئی غور سے نہیں سنتا کانا پوسی پر لوگ اپنے کان کھڑے کرتے ہیں۔

۱۹۶۱ء کی بات ہے۔ شہر میں فساد ہوگیا تھا۔ ایک جلوس نکلا تھا، جو یونیورسٹی کی طرف رخ کیے ہوئے تھا۔ کلکٹر نے اسے کمٹڈ پلے سے واپس کرکے تتر بتر کردیا۔ لیکن پھر افواہوں نے رائی کا پربت بنا دیا۔ اتفاق سے میرا بھائی آفاق اس وقت ریلوے روڈ پر پھنس گیا تھا۔ بہر حال وہ کسی نہ کسی طرح آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جلوس کے گزرنے پر لوگوں نے اپنی اپنی دکانیں بند کرلیں۔ امین صاحب میرے پاس آئے اور صورتِ حال دریافت کرنے لگے۔ میں نے جو کچھ سنا تھا بیان کردیا۔ اس میں کوئی گرما گرم بات نہ تھی۔ اس لیے امین صاحب کو مایوسی سی ہوئی۔ ذرا سی بات کو وہ بال کاٹتے ہوئے کیسے سنائیں۔ چنانچہ سر جھکائے جارہے تھے اتنے میں ان کی نظر ایک مہتر پر پڑی۔ انھوں نے اس سے دریافت کیا۔ اس کی بات چیت میں انھیں کچھ امید کی جھلک نظر آئی۔ امین صاحب اسے بڑے رازدارانہ انداز میں ایک طرف لے گئے اور ریلوے روڈ کا حال دریافت کرنے لگے۔ اس مہتر نے بتایا کہ " حضور! جب جلوس آگے بڑھا تو میں پیچھے چلا گیا بتاؤں کیسے یہاں تک پہنچا۔ سڑک پر لاشیں پٹی پڑی تھیں۔ قدم اٹھا کر بچتا بچاتا ادھر آیا۔ میرے دونوں پاؤں خون میں تر بہ تر ہوگئے۔ ابھی یہیں نل پر کھڑے ہوکر آپ کے سامنے پیر دھوئے ہیں "

اس مہتر کا بیان سن کر سب بے حد خوش ہوئے۔ اس کی خوب خاطر مدارات کی۔ بیڑی پلائی اور ساتھ عزت کے رخصت کیا۔ اذیت پسندی شاید انسانی فطرت میں رچی ہوئی ہے۔ انسان حادثے کو حادثہ نہیں سمجھتا، چاہے وہ حقیقت ہو یا افواہ۔ افواہ کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب جان کینیڈی کے گولی لگی اور وہ گر گئے تو چاروں طرف فوٹوگرافروں کے کیمرے چلنے لگے۔ اور لوگوں نے کینیڈی کو گھیر لیا۔ کینیڈی

کی بیوی نے مجمع کو ہٹانے کے لیے کہا اور بولیں" آپ لوگ پیچھے ہٹیے۔ تازہ ہوا لگنے دیجیے"

اس وقت مجمع میں سے کسی نے کہا" میڈم! اس وقت تاریخ کے محفوظ کرنے کا مسئلہ ہے۔ آپ کو تازہ ہوا کی پڑی ہے ـــــ"

آخر یہ سب کیا ہے۔ انسان کی زندگی کی اہمیت ہے یا گرما گرم خبر کی۔

دواؤں کی دکان امین صاحب کی دکان سے اتنی ملی ہوئی ہے کہ ایک میں جانے کے لیے دوسرے میں داخل ہو سکتا ہے۔ یہاں دواؤں سے زیادہ ڈاڑھیوں کی فراوانی ہے اور جسم کے بجائے روح کا علاج ہوتا ہے۔ اور اگر جسم کے علاج کا معاملہ ہے تو یہ کم بخت جسم خود فانی ہے۔ یوں تو اس دکان کا نام مدینہ فارمیسی ہے۔ لیکن یہ پہچانی جاتی ہے مولاناؤں کی داڑھیوں سے۔ یہاں دوائیں نسخے کے اعتبار سے نہیں ملتیں بلکہ دواؤں کے لحاظ سے لوگوں کو اپنے مرض کو بدلنا چاہیے۔ اب لوگوں نے اس طریقہ سے بچنے کے لیے ایک طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ ڈاکٹر کا نسخہ تو جیب میں رکھتے ہیں اور کسی ایک داڑھی والے سے اپنی بیماری کا علاج دریافت کرتے ہیں جو وہی دوا تجویز کرتے ہیں جو ان کے پاس ہوتی ہے۔ اس طرح دوا تو مل جاتی ہے۔ رہا مرض کا ٹھیک ہونا نہ ہونا، اللہ کے ہاتھ میں ہے، بندوں کا اس پر کیا اختیار رہے۔ جب اللہ کو ٹھیک کرنا منظور ہوگا تو اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔

تو یہ ہے مدینہ فارمیسی ـــ یہ دور سے نظر آتی ہے اور اس کی پہچان یہ ہے کہ جہاں بہ یک وقت کچھ گورے گورے نوجوان مع اپنی داڑھیوں کے کرتا پہنے، یا اچکن زیب تن کیے ہوئے نظر آئیں سمجھ لیجیے کہ یہ شمشاد کی انگریزی دواؤں کی دکان ہے۔

یہ ایک زمانے میں حامد علی بلڈنگ کی سب سے شاندار دکان تھی۔ پہلے یہ دکان اور اس کے بغل والی دکان جس میں مدراس ہینڈ لوم ہاؤس ہے۔ دونوں ایک ہی تھیں ایک نواب صاحب نے زمینداری کے خاتمے پر بانڈ بیچ کر یہاں جنرل مرچنٹ کی ایک دکان رکھ لی تھی۔ بڑا شاندار فرنیچر تھا جس کے کچھ آثار آپ داڑھی والی دکان میں دیکھ سکتے ہیں۔

ہاں تو ان نواب صاحب نے بڑی شان سے یہ کاروبار شروع کیا۔ سب سامان آ گیا تو نواب صاحب نے کچھ آرام کرسیاں منگوائیں اور ایک حقّہ درمیان میں رکھا گیا۔ نوکر کا یہ کام تھا کہ وہ ذرا ذرا سی دیر میں چلم بھرتا تھا۔ نواب صاحب گاہکوں کا کم اور مہمانوں کا زیادہ انتظار کرتے تھے۔ شروع میں تو یونیورسٹی کے لڑکے ذرا زیادہ تعداد میں نظر آتے تھے پھر یہ تعداد گھٹتے گھٹتے معدوم ہو گئی۔

دراصل بات بہت معمولی تھی۔ نواب صاحب سامان بیچنے سے زیادہ تہذیب سکھانے پر زور دیتے تھے۔ ایک لڑکے نے تولیا طلب کی۔ نواب صاحب ایک مہمان سے گفتگو میں مصروف ہیں۔ سیاست حاضرہ پر تبصرہ ہو رہا ہے۔ لڑکے نے دوبارہ اپنی درخواست پیش کی۔ نواب صاحب نے پھر سنی ان سنی کر دی۔ لیکن تیسری بار اسی بات کے دہرانے پر نواب صاحب اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے۔ اکدم سے کھڑے ہو گئے۔

"میاں صاحبزادے! آپ نے کہاں پرورش پائی ہے کہ تہذیب کی الف بے سے واقف نہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ میں ایک اور صاحب سے گفتگو کر رہا ہوں۔ اور آپ دیر سے دخل درمعقولات کر رہے ہیں۔ شمشاد میں یہی تو ایک دکان نہیں جہاں تولیا بکتی ہے اور دکانیں بھی ہیں کہیں سے بھی جا کر لے لیجیے۔"

وہ بے چارا اپنا سا منہ لے کر چلا گیا اور پھر نواب صاحب دیر تک نوجوانوں کی عدم تہذیب کا ماتم کرتے رہے۔

"حضور! اب نہ جانے کہاں کہاں سے لڑکے یہاں پڑھنے آجاتے ہیں۔ بھلا ان ہی کو دیکھیے، یہ جو صاحبزادے آرہے ہیں۔ سینڈل پہنے اور کمرے سے نکل کھڑے ہوئے۔ کون کہہ دے گا کہ کسی شریف خاندان کے ہیں اور بزرگوں سے انھیں ورثے میں بھی کچھ ملا ہے۔ بس صاحب کانگریس کا راج کیا آیا گنوار گردی آگئی۔ چار چوڑوں کی بن آئی ہے۔ جسے دیکھیے بس یونیورسٹی میں پڑھنے چلا آرہا ہے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ باپ دادا ہل چلاتے تھے تم بھی وہی کام کرو۔ نہیں صاحب ہم تو انگریزی پڑھیں گے۔ انگریزی نہ ہوئی عربی فارسی ہو گئی۔ بڑے آئے ہیں پڑھنے"

ابھی ان کی تقریر ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ لڑکا دکان میں داخل ہو گیا لڑکے نے آتے ہی پوچھا" زرا فورہنس ٹوتھ پیسٹ دیجیے گا۔"

نواب کی دکان میں یہ ٹوتھ پیسٹ موجود ہے لیکن وہ کہتے ہیں۔

"میاں صاحبزادے یہ ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے کا مشورہ آپ کو کس نے دیا ہے۔ کوئی منجن استعمال کیجیے۔ جبّار کے یہاں مل جائے گا اتفاق سے ایسی چیزیں میں نہیں رکھتا، اور برش سے تو دانت اور مسوڑھے دونوں خراب ہوتے ہیں۔ کیوں میر صاحب! میں صحیح کہہ رہا ہوں۔"

میر صاحب نے بھی سر ہلایا اور پھر بدستور حقے کے کش لینے لگے۔

نواب صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "حقیقت یہ ہے کہ یہ لونڈے فیشن کے پیچھے مرے جارہے ہیں۔ ہاں صاحب اگر ایسا ہی برش کرنے کو جی چاہتا ہے تو نیم کی مسواک استعمال کیجیے، موتی سے دانت نکل آئیں گے۔"

یہ کہہ، نواب صاحب نے نوکر کو حکم دیا: "ابے حرامزادے اندا

نیم کے پیڑ پر چڑھ کر ایک مسواک توڑ لا۔"

نوکر بھاگا بھاگا چلا گیا۔ نواب صاحب نے خریدار کو دکان کے اندر لے جاکر بٹھایا۔ پھر اس کے باپ دادا کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔ اور جب لڑکا مسواک توڑ کر لایا تو لفافے میں رکھ دی اور بہت سی نصیحتوں کے ساتھ رخصت کیا اور بولے "صاحبزادے! تم دور کے رہنے والے ہو، کبھی کبھی آجایا کرو۔ بزرگوں کے پاس بیٹھو گے تو کوئی کام کی بات معلوم ہو ہی جائے گی۔"

وہ بیچارا افور ہنس ٹوتھ پیسٹ لینے آیا تھا، مسواک کے ساتھ کچھ نصیحتیں اور ہدایتیں لے کر چلا گیا۔

نواب صاحب نے دکان تو کھول لی تھی لیکن وضع داری کو قائم رکھا تھا اور یہ چاہتے تھے کہ لوگ تہذیب کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ لہذا یہ توقع رکھتے کہ پہلے سلام دعا ہو، مزاج پرسی ہو۔ پھر کوئی مقصد کی بات ہو۔ یہ نہیں کرتے کہ آتے ہی منھ مار دیا۔ ایک روز نواب صاحب دکان میں بیٹھے روزنامہ سیاست کا مطالعہ فرما رہے تھے کہ ایک لڑکے نے آکر لکس صابن طلب کیا۔ نواب صاحب نے اپنا مطالعہ جاری رکھا لیکن ماتھے پر متعدد بل پڑ گئے۔ ان کو یہ بات پسند نہ تھی کہ لڑکا زیادہ دیر کھڑا رہے فرمایا "لکس نہیں ہے۔"

اس نے کہا "رکسونا دے دیجیے"

کہنے لگے "وہ بھی نہیں ہے۔"

وہ لڑکا جھنجھلا گیا کہنے لگا "کوئی بھی صابن دے دیجیے۔"

نواب صاحب کہنے لگے "سرکار! کوئی صابن نہیں ہے۔"

لڑکے نے الماری کی طرف دیکھا اور بولا "اور یہ کیا نظر آرہے ہیں۔"

اب تو نواب صاحب کو بہت غصہ آیا۔ شاید دل ہی دل میں جھینپے

بھی ہوں ۔" بولے ۔ جناب آپ بھی خوب آدمی ہیں۔ میری بات کا یقین نہیں کرتے اور الماری سے تصدیق کرتے ہیں یہ شمشاد مارکٹ ہے اور بھی کئی دکانیں ہیں کہیں سے لے لیجیے۔ پھر یہ بھی بات ہے کہ یہ میرا مال ہے، نہیں بیچتا۔ کوئی زبردستی ہے ۔"

وہ لڑکا بڑبڑاتا ہوا چلا گیا اور نواب صاحب جھنجھلاتے رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کاروبار بہت دنوں تک نہیں چل سکتا تھا۔ نواب صاحب کے بقول اگر دکان سے ایک پیسہ بھی کھایا ہو تو مجھے زہر کھایا۔ آخر یہ دکان انھوں نے انجمن ترقی اردو ہند کے ہاتھ فروخت کر دی۔

لوگ کہتے ہیں کہ علی گڑھ نوابوں کا شہر ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے "علی گڑھ یونیورسٹی" نہ بجنور میں بن سکی اور نہ مرادآباد میں۔ یہاں کے نوابوں نے سرسید کو اس دھول اڑتے ہوئے شہر میں بڑے بڑے سبز باغ دکھائے اور سرسید کو اپنے مقصد میں کامیابی بھی ہوئی۔ یہاں کئی قسم کے نواب ملتے ہیں۔ ان میں بیشتر وہ ہیں جو علم میں نہیں اپنی کھال میں، اور اس شہر کی کھال میں مست رہتے ہیں جو ان کے ڈرائنگ روم میں سجی ہوئی ہے اور یہیں کہیں آپ کو سرسید کے ساتھ ان کی تصویر بھی مل جائے گی۔ جو ان کے بزرگوں نے خدا جانے کس مصلحت سے کھنچوائی تھی۔

اب جب ایک نواب کا ذکر چھڑ گیا تو تھوڑی دیر اس سلسلہ کلام کو جاری رکھا جائے مجھے علی گڑھ کے نوابوں سے کبھی کوئی ذاتی سابقہ نہیں رہا البتہ مجھے اور ڈاکٹر نور الحسن صاحب کو ذاکر حسین ماڈل اسکول کا خیال آیا تو اکثر نوابوں سے ملاقات ہوئی بعض حضرات کے درِ دولت پر اتنے چکر لگانے پڑے کہ اگر ہم لوگ جوتے نہ خریدتے اور اس رقم کو خود اسکول کے چندے میں دے دیتے تو بھی فائدے میں رہتے ۔

لیکن اس عمل میں نواب صاحب چھتاری کے صاحبزادے ابن میاں سے ملاقات ہوئی ان کی حوصلہ افزائی سے بڑا سہارا ملا، کنور عمار احمد خاں نے چندہ تو اتنا نہیں دیا لیکن مشورے اتنے دیے کہ بھلے ہی ہم خالی ہاتھ آئے ہوں لیکن ہمارے ذہن ان کے تجربوں سے بھرے ہوتے تھے۔ صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے صاحبزادے الحاج خاں بہادر عبیدالرحمٰن خاں شیروانی سے مسلسل تعاون ملتا رہا۔ صدر یار جنگ پر یاد آیا۔ موصوف حیدرآباد سے جب مستقل طور پر آ گئے تو علی گڑھ میں ہی اپنی شاندار کوٹھی میں رہتے تھے۔ ان کے علم کا دور دور چرچا تھا۔ مولانا آزاد بھی ان کے تبحرِ علمی کے قائل تھے۔ لیکن ہم علی گڑھ والوں کے لیے ان کی اہمیت اس اعتبار سے بھی تھی کہ ہم جب کوئی جلسہ کرنا چاہتے تھے۔ تو صدر کی تلاش میں در در کی ٹھوکریں کھاتے تھے اور اس فکر میں رہتے تھے کہ کوئی نیا صدر مل جائے کبھی سلطان حیدر جوشؔ کو پکڑ لاتے، کبھی نیلی چھتری کے مصنف کو ــــ غرض جو بھی مل جاتا، لے آتے، لیکن جب کوئی نہ ملتا تو پھر حبیب منزل کا رخ کرتے صدر یار جنگ ہمیشہ یہی کہتے ــ "ارے بھائی، اس بڑھاپے میں مجھے کیوں زحمت دیتے ہو" اور ہم کہتے "حضور! ہم نے جان توڑ کوشش کر لی اور جب کوئی اور نہ ملا تو آپ کے پاس آئے ہیں۔"

یہ جملہ سن کر بہت خوش ہوتے اور ہماری دعوت کو قبول کر لیتے رشید صاحب نے تو "یوم اقبال" کے موقع پر اپنی تقریر میں بڑے مزے میں کہا تھا کہ "نواب صاحب آپ ہماری قوت بھی ہیں، اور ہماری کمزوری بھی۔ چنانچہ ہماری یہی قوت ان کے لائق صاحبزادے حاجی عبیدالرحمٰن خاں شیروانی میں بھی ہے۔ ہم جب چاہتے ہیں انھیں صدارت کی کرسی پر لاکر بٹھا سکتے ہیں اور جب وہ تقریر کرتے ہیں تو علی گڑھ

کے ماضی کی بہت سی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں ۔

علی گڑھ کے رؤسا میں بیگم انور جہاں صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا ۔ جو اپنے نام سے زیادہ اپنی پان والی کوٹھی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں ۔

اسی اسکول کی جد و جہد کے سلسلہ میں نواب سر مزمل اللہ خاں شروانی کے صاحبزادے سے بھی ملاقات ہوئی۔ نواب رحمت اللہ خاں شروانی سے جو کچھ ملا اُسے میں تو کیا علی گڑھ کے علم دوستوں کی آئندہ نسلیں بھی نہ بھول سکیں گی ۔

نواب صاحب سے میری پہلی ملاقات بہت خوشگوار نہ تھی۔ اب سے انیس سال پہلے کی بات ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند کی ایک تاریخی کانفرنس ہوئی تھی۔ جب مولانا آزاد نے اسی جگہ اپنی آخری تقریر کی تھی جہاں آج ان کا مدفن ہے۔ میں نواب صاحب کی اس ملاقات کو بلاوجہ کی ملاقات کہہ رہا ہوں۔ اس وقت میں انجمن ترقی اردو ہند میں ایک معمولی کارکن تھا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ایسے ہی کارکنوں پر ایسے کانفرنس کے زمانے میں بُرا وقت بھی آپڑتا ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری نواب صاحب کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ میں اپنے اعمال سے اکثر شرمندہ ہوتا رہا ہوں۔ اس روز میرے الہ آباد کے "فسانہ" اور "شاہکار" کے ایڈیٹر محمود احمد ہنر شاہ جہاںپوری بھی میرے ساتھ تھے۔ جن سے میرے دیرینہ اور گہرے مراسم تھے۔ جی میں آیا کہ ان پر بھی اس وقت رعب پڑ جائے تو کیسا رہے۔ چنانچہ میں نے سکریٹری صاحب کو سلام کر لیا۔ ان کو شاید میری ایک پرانی خطا یاد آگئی جو شاید میری خطا بھی نہیں تھی بلکہ مجھ سے بھی کیا، ان سے بھی بڑے آدمی سے سرزد ہوئی تھی۔ لیکن میں عضو ضعیف تھا اس لیے نزلہ میرے اوپر گر گیا میری

کیفیت اس وقت شکنتلا کی سی تھی کہ دشینت اسے پہچاننے سے انکار کرتا اور الٹا اس پر الزام لگاتا ہے۔ مجھ کو اس عتاب کا اتنا غم نہ تھا جتنا اس بات کا کہ روزے گلے پڑ گئے تھے اور اب محمود احمد ہنر کیا سوچیں گے اور بعد میں پتہ چلا کہ اس کا ایک گواہ ایک نواب بھی ہے تو گویا ایک گھڑا پانی اور پڑ گیا۔

اس واقعہ کے بعد میں پھر کبھی نواب رحمت اللہ خاں شروانی سے نہیں ملا۔ جب کہیں نظر آتے تو میں ہمیشہ یہی سوچتا کہ جیسے میں نے ان کے محل میں جاکر چوری کی ہے اور انھوں نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے اور میں چپ چاپ کتراکر نکل جاتا۔ یہ سانحہ بھی مجھے ہی یاد رہ گیا ہے۔ ورنہ اس لمحے کے "تینوں" "گواہان" اس کو بھول گئے ہوں گے۔

پھر تو میں سولہ سال تک نواب رحمت اللہ خاں شروانی سے چھپا چھپا پھرتا رہا۔ کبھی کہیں ذکر آیا اور ملنے کو جی چاہا، ان کی شاندار لائبریری دیکھنے کی آرزو ہوئی تو ان افواہوں نے ڈرا دیا کہ نواب صاحب من موجی ہیں دیوانے ہیں، کچھ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ایک روز جب ذاکر حسین ماڈل اسکول کی زمین کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالحلیم صدیقی، ڈاکٹر نورالحسن اور راقم الحروف علی گڑھ کے کلکٹر پنڈت صاحب سے ملے اور انھوں نے اس زمین کے دینے کا ارادہ ظاہر کیا جو مزمل منزل کے صدر پھاٹک کے پاس دودھ پور سے آنے والی سڑک کے تراہے پر پان والی کوٹھی کے بائیں جانب ایک تکونے پارک کی شکل میں پڑی ہوئی ہے تو دم میں دم آیا۔ اس وقت ایسا لگا جیسے تین دن کے فاقہ زدہ کو کوئی سوکھی روٹی کا ٹکڑا دے دے۔

ہم تینوں وہ جگہ دیکھنے پہنچے اور وہاں کھڑے ہوکر دیر تک خوش ہوتے رہے۔ حلیم صاحب نے مزمل منزل کی طرف اشارہ کیا کہ نواب

صاحب اپنی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے ہیں کیوں نہ انھیں یہ خبر سنادی جائے کہ آپ کے پڑوس میں اسکول کھل رہا ہے علم دوست ہیں خوش ہو جائیں گے۔ چنانچہ ہم تینوں ان کی خدمت میں پہنچے۔

عبدالحلیم صدیقی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے بیٹے تھے۔ اس سبب وہ قدم جما جما کر چل رہے تھے۔ پھر یہ کہ اس کوٹھی میں ان کا آنا جانا تھا۔ ڈاکٹر نورالحسن نقوی نے جب حلیم صاحب کو کار سے اترتے اور اکڑ کر چلتے دیکھا تو وہ اپنی کھال میں مست ہو گئے۔ کیونکہ وہ امروہہ کے پیرزادے بھی تو ہیں اور راقم الحروف کے دل و دماغ میں ایک طوفان اٹھ رہا تھا کہ نواب صاحب کو سولہ سال پہلے کا واقعہ یاد نہ آجائے۔ انسان بھی اپنے آپ کو کتنی اہمیت دیتا ہے اور اپنی ذات کو نہ جانے کیا سمجھتا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو چھپانے کے لیے شیروانی کے تمام بٹن لگا دیے اور ان کو سلام کیا۔ مجھے یقین ہے کہ نواب صاحب کو وہ واقعہ یاد نہیں آیا کیونکہ پھر برابر ملاقات ہوئی اور نواب صاحب یا تو بھول گئے یا ان کی خاندانی شرافت نے نظر انداز کیا اور مجھے شرمندگی سے بچا لیا۔

پہلی بار اس روز میرے سامنے نواب صاحب کی شخصیت آئی جس کو علی گڑھ کے بڑوں نے چھپا کر رکھ دیا تھا۔ نواب چھتاری ناراض تھے۔

"آپ یہاں سڑک پر بچوں کا اسکول کھولیں گے۔ مزمّل منزل والی سڑک پر۔"

پہلے تو مجھے ان کا یہ انداز بُرا لگا لیکن پھر دوسرے جملے نے اس اثر کو زائل کر دیا۔ نواب صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا "کل خدانخواستہ کسی گاڑی سے اسکول کا کوئی بچہ کچل گیا تو لوگ یہی کہیں گے کہ نواب صاحب کی کوٹھی کے سامنے یہ حادثہ ہوا۔ اسکول آپ بنائیں گے اور بدنامی مزمّل منزل کی ہوگی۔ میں اس کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔"

اب تو ہم لوگوں کے آئے حواس جاتے رہے لیکن پھر بولے:" یہ آخر اتنی بڑی زمین جو میری کوٹھی میں ہے یہ کس دن کام آئے گی جتنی زمین کی ضرورت ہو لے لیجیے اور کام شروع کر دیجیے اور جب تک عمارت نہ بنے میرا ڈرائنگ روم استعمال کیجیے مگر ذاکر صاحب کے نام پر اسکول ضرور کھلنا چاہیے۔ اور اس کے دروازے ہر مذہب و ملت کے لیے کھلے ہونے چاہییں۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ میں بہت دنوں سے روزانہ اسکول کے خواب دیکھا کرتا تھا مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ بھی کوئی خواب نہ ہو۔ میں نے منھ پیچھے کر کے اپنی ایک انگلی دانتوں سے کاٹی ۔ نہیں ۔ میں جاگ رہا تھا۔ میری دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میرے سامنے ڈاکٹر عبدالحلیم، ڈاکٹر نورالحسن اور نواب صاحب بیٹھے ہوئے تھے، تفصیلات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ہمارا دامن پھیلا ہوا تھا۔ نواب صاحب نے اللہ والی کوٹھی کے سامنے والی زمین (جس میں اب اسکول ہے) سے لے کر امرود کے باغ کے پیچھے تک کی زمین دے دی تھی جو تقریباً بیس ہزار مربع گز ہو گی اور اس وقت کی قیمت کے اعتبار سے دس لاکھ روپئے سے زیادہ کی ہو گی ہمارا دامن پھیلا ہوا تھا۔ نواب صاحب نے اس میں ساری زمین ڈال دی تھی لیکن دامن پھٹ گیا صرف پانچ ہزار گز زمین رہ گئی۔

نواب صاحب قوم پرست ہیں۔ وہ دیندار اور عبادت گزار ہیں اور جو لوگ ان چیزوں کا سودا کرنا چاہتے ہیں وہ اس کی اچھی قیمت وصول کرتے ہیں۔ علی گڑھ میں اس کے دام بھی ملتے ہیں اور رہنے والے فائدے میں بھی رہتے ہیں۔ لیکن نواب صاحب نے بیچنا تو درکنار کہیں اشتہار بھی نہیں کیا۔ اگر وہ چاہتے تو منصب بھی حاصل کر سکتے تھے۔ ان کے باپ سر مزمل اللہ خاں نے تو یونیورسٹی پر اتنے احسانات کیے ہیں کہ اگر یہ ادارہ انسانی شکل میں چل

سکتا تو مزمّل منزل کے سامنے اس کا سر شکر گزاری سے جھک جاتا۔

چند روز بعد کرنل بشیر حسین زیدی سے کنور عمار احمد خاں صاحب کی بیٹیا کی شادی میں ملاقات ہوئی میں نے ان سے نواب صاحب کے اس عطیے کا ذکر کیا۔ زیدی صاحب نے کہا کہ" اس وقت پانچ ہزار گز زمین کافی ہے۔ باقی کوئی اور اللہ کا بندہ دے دے گا۔ نواب صاحب سے اور مت لینا۔کیونکہ وہ تو ان لوگوں میں سے ہیں کہ اگر کوئی تن کے کپڑے بھی مانگے تو انھیں عذر نہ ہوگا سچ ہے جیسی نیت ویسی برکت۔نواب صاحب نے جس خلوص اور جذبے کے ساتھ زمین دی تھی اس کا یہ اثر تھا کہ آج علی گڑھ اور علی گڑھ سے باہر کے تقریباً ایک ہزار بچے یہاں تعلیم پا رہے ہیں۔حاجی عبید الرحمٰن خاں شروانی نے ایک جلسے میں فرمایا تھا کہ یہ وہ زمین ہے جس پر سر مزمّل اللہ خاں چلے ہیں اور یقیناً یہ زمین سرسبز رہے گی، اور یہاں کے پڑھے ہوئے طالب علم ان کے نقش قدم پر چلیں گے اور اپنے ملک کی خدمت کریں گے۔جیپ فلیش لائٹ کے جناب ام، آر، شروانی اور ان کے بھائی اور میرے کرم فرما احمد رشید شروانی جب اسکول دیکھنے آئے تو جناب ام، آر، شروانی نے کہا" ارے بھائی! نواب صاحب نے یہ ساری زمین دے دی؟"

احمد رشید صاحب نے برجستہ کہا" یہ کوئی حیرت کی بات نہیں، وہ آخر کس کے بیٹے ہیں!"

ایک بار علی گڑھ کے سب سے بڑے سرمایہ دار کی بیوی نے اسکول میں ایک" ونگ" کی تعمیر کے لئے روپے دینے کا وعدہ کیا۔ہم نے صورت سے انھیں درد آشنا سمجھا اور جمع جوڑ کے ان کے نام کا ایک ونگ کھڑا کر دیا بلکہ ان کا نام بھی نمایاں طور پہ لکھ دیا لیکن جب معاملے کی بات آئی تو اس رئیسہ نے ایک معمولی سا اختلاف کر کے چندہ دینے سے انکار کر دیا۔ ہمیں تو اپنی توہین کا احساس نہیں ہوا لیکن یہ خیال ضرور آیا کہ اگر اس نام

کو مٹائیں گے تو لوگ کیا کہیں گے۔ میں بہت سی باتیں برداشت کر لیتا ہوں لیکن سیکولرزم کی توہین برداشت کرنا میرے بس میں نہیں اور بظاہر میرا سیکولرزم خطرے میں پڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

جب ایسی کوئی صورت ہوتی ہے تو میں اور نورالحسن صاحب ایک دوسرے کا غم غلط کرتے ہیں اور جب ہم ایسا نہیں کر پاتے تو پھر ہمارے قدم اپنے آپ مزمل منزل کی طرف اٹھ جاتے ہیں۔ اس وقت ہم لوگ باتیں نہیں کرتے، چُپ چاپ پیدل چلے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو پتا نہیں چلنے دیتے کہ ہماری آنکھیں کتنی نم ہیں۔ ہم اس خاتون کی جھڑک سن کر نواب صاحب کے پاس پہنچے ہم نے انھیں دیکھا اور جیسے انھوں نے ہمارا دل اپنی حفاظت میں لے لیا۔ بڑھ کر اپنے رومال سے ہمارے آنسو پونچھے اور کہا" ابھی میں زندہ ہوں، کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کیوں گئے تھے۔ آپ لوگ یونیورسٹی کے معزز استاد ہیں۔ ایک گھٹیا سرمایہ دار کے سامنے دستِ سوال پھیلانے کی کیا ضرورت ہے" چنانچہ اس خاتون کا نام اسی روز حرف غلط ثابت ہوا۔

نواب صاحب نہیں چاہتے تھے کہ ہم لوگ اسکول کے لیے دربدر مارے پھریں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے ہمارے سامنے چندے کے لیے لوگوں کے سامنے ہاتھ بھی پھیلایا۔ رات رات بھر جاگ کر لوگوں کو عطیے کے لیے خطوط بھی لکھے۔ علی گڑھ کے بعض رؤسا کو یہ بات ناگوار گزری کہ نواب سرمزمل اللہ خاں کی اولاد ایک اسکول کے چندے کے لیے معمولی معمولی لوگوں کے گھروں پر جائے۔ چنانچہ انھوں نے ایک پیغام بھیجا۔ اتفاق سے اس وقت میں بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ نواب صاحب کو یہ مداخلت ناگوار گزری لیکن انھوں نے بڑے سکون سے جواب دیا کہ "ان حضرات سے میرا اسلام کہیے گا اور یہ فرمائیے گا کہ یہ ہاتھ میاں نے ایک

ذریعے کے لینے پھیلا یا ہے اور میں اس قوم کا ایک ادنیٰ فرد ہوں۔ ہاتھ تو سرسید نے بھی پھیلایا تھا اور میں سرسید کی خاک پا بھی نہیں۔"

اسکول کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا تھا جتنا روپیا جمع ہوا تھا وہ ختم ہو گیا تھا بھٹے والے کو روپیا دینا تھا۔ مزدوروں کی مزدوری باقی تھی کوئی راستہ نظر نہ آرہا تھا۔ میں روپے کا انتظام کرنے گیا ہوا تھا۔ اور کچھ انتظام ہو گیا تھا میرے ایک عزیز دوست ساما آٹو موبائل دہلی کے شرماجی نے کچھ چندے اور کچھ قرض کے طور پر دے دیا تھا۔ لیکن جب میں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے آم کے دو پیڑوں کو کٹوا کر کام کو جاری رکھا ہے۔ ان پیڑوں کے کٹنے کا مجھے بھی بے حد افسوس ہوا اور زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ یہ پیڑ نواب صاحب کو بے حد عزیز تھے۔ میں بڑی سنجیدگی سے نواب صاحب کے سامنے گیا۔ نواب صاحب نے کہا ——

"پرویز صاحب! خدا کا شکر ہے کہ قرض ادا ہو گیا اور کام نہیں رکا۔"

میں نے کہا "ان پیڑوں کے کٹنے کا مجھے بھی ملال ہے۔"

کہنے لگے کہ "اس میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قوم کے نونہالوں کے لیے یہ آم کے پیڑوں کی قربانی ہے۔"

اور میں نے دیکھا کہ نواب صاحب کی آنکھیں نمناک تھیں ان کی آواز بھرّا گئی تھی۔ جب علی گڑھ تانگر لاکس کے شری سریندر رکمار کے پاس گئے تو انھوں نے خود ہم سے یہ سوال پوچھا "آپ جانتے ہیں کہ یہ نواب صاحب کیسے آدمی ہیں۔ جب گاندھی آئی ہوسپٹل زیر تعمیر تھا اور ہم منزل منزل گئے تو نواب صاحب نے اس کار خیر کے لیے اپنی زمینداری کے بانڈ لاکر دیے اور ہمیں لینے پر مجبور کر دیا۔" سریندر رکمار جی کی آنکھیں نم تھیں۔ انھوں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "آپ کے ساتھ ایک ایسا آدمی موجود ہو تو آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ میرے پاس بے تکلف آئیے، نواب صاحب

کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو کچھ کر سکوں گا اس سے گریز نہ کروں گا" سچ ہے سر بلند رکھا رجی اپنی بات کے دھنی نکلے۔ نواب صاحب کے عطیے کے بارے میں کہنے لگے کہ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ میرے پاس اتنا بڑا کارخانہ ہے، مختلف موقعوں پر چندہ دیتا رہتا ہوں، لیکن اگر کوئی مجھ سے کہے کہ اپنی کوٹھی کی پانچ گز زمین دے دو تو شاید میں نہ دے سکوں گا۔ یہ نواب صاحب کی وسعت قلب ہے اور شاید یہی بات ہے کہ ان کو کام کرنے والوں کا ایک اچھا حلقہ مل گیا ہے۔ انھیں ڈاکٹر نور الحسن جیسے تجربے کار النسان کا تعاون حاصل ہے۔ ڈاکٹر عالم حسین جیسے نوجوان کا جذبۂ ایثار وخدمت کہ یہ اسکول دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔

ایک روز میں نواب صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ایک صاحب سہارن پور کے کسی نام نہاد مدرسے کے نام سے چندہ لینے آئے۔ مجھے ان کی باتوں سے پانچ منٹ کے اندر اندازہ ہو گیا کہ یہ سب جعلی کاروبار ہے۔ کمانے کھانے کا دھندا ہے۔ نواب صاحب نے پیشکار صاحب کو بلوایا اور سو روپے دے دیے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نواب صاحب بڑے سادہ لوح ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو اس طرح ان سے پیسے اینٹھتے ہیں۔ مجھے بھی شاید ان کی سادہ لوحی کا یقین آجاتا لیکن جب وہ آدمی چلا گیا تو میں نے کہا" نواب صاحب! مجھے تو یہ آدمی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، کوئی مدرسہ نہیں ہے۔ اس کا یہی کاروبار معلوم ہوتا ہے"

نواب صاحب اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور بولے" پرویز صاحب! مدرسہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ آدمی مفلوک الحال ہے اور اس کی عزت رکھنا بھی ہمارا فرض ہے"

اس روز مجھے معلوم ہوا کہ نواب صاحب کی سادہ لوحی کہاں تک پہنچتی ہے۔ میرے ایک بہت عزیز دوست مختار احمد خاں کا خیال ہے کہ

علی گڑھ میں کوئی نواب ہے تو وہ رحمت اللہ خاں شیروانی ہیں۔ مختار صاحب ان سے صرف ایک یا دو بار ملے ہیں لیکن ان کی شخصیت کی چھاپ مختار صاحب پر آج بھی قائم ہے۔ اور یہ بھی خدائے بخشندہ کی بخشش ہے۔

علی گڑھ میں نواب سر مزمل اللہ خاں کے کتنے ایسے واقعات سننے میں آتے ہیں لیکن یہ تو میں نے عالمِ بیداری میں اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ بڑے باپ کے بڑے بیٹے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

"غبارِ خاطر" میں مولانا ابوالکلام آزاد نے فارسی کے اکثر اشعار برمحل استعمال کیے ہیں لیکن شعرا کے نام نہیں دیے ہیں اور کچھ ناموں کے بارے میں ان سے سہو بھی ہو گیا ہے۔ نواب صاحب نے بڑے خلوص کے ساتھ ان تمام اشعار کی نشان دہی کی، اور اردو ادب کے ایک بڑے محقق ان کے اس کام کو ان کے گھر آکر لے گئے اور جب "غبارِ خاطر" کی اگلی اشاعت ہوئی تو اس سے پورا پورا استفادہ کیا لیکن نواب رحمت اللہ خاں شیروانی کا کہیں حوالہ بھی نہیں دیا۔ جب نواب صاحب نے یہ کتاب دیکھی تو بے حد خوش ہوئے کہ اب یہ کمی بھی پوری ہو گئی۔ انھیں اپنی حق تلفی کی کوئی شکایت کبھی نہیں ہوئی۔

مجھے کبھی کبھی اپنے بزرگوں کی اس بات سے بڑی تکلیف ہوتی ہے جن کی شہرت کی بھوک پیاس کبھی نہیں مٹتی۔ جو ساٹھ ستر سال کی عمر میں بھی اپنا نام کسی رسالے میں چھپا ہوا دیکھ کر ویسے ہی خوش ہوتے ہیں جیسے اٹھارہ انیس برس کا لڑکا جب اپنی پہلی نظم یا افسانہ چھپا ہوا دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب آدمی کا قد چھوٹا ہوتا ہے تو آدمی مصنوعی طریقے اختیار کرتا ہے۔

مزمل منزل سے شمشاد کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ آئیے پھر شمشاد چلیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ انجمن ترقی اردو نے نواب صاحب کی دکان

خرید لی اور بنیاد علی صاحب کو دکان پہ بٹھا دیا ۔ بنیاد علی انجمن کے ایک کارکن تھے لیکن انجمن کا بورڈ لگنے کے باوجود یہ کتابوں کی دکان کم، دفتر زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ جس وقت انجمن کا سلطان جہاں منزل کا دفتر کھلتا تھا، اس وقت یہ دکان بھی کھلتی تھی اور شام کو چار بجے دفتر کے ساتھ بند ہو جاتی تھی۔ یہی شام کا وقت شمشاد میں بکری کا ہوتا تھا اور اس وقت دکان میں تالا پڑا ہوتا۔ مولوی محمد حفیظ الدین صاحب، انجمن کے نائب معتمد تھے۔ انھوں نے بڑی اسکیمیں تیار کیں، بہت زور لگایا۔ لیکن دکان ایک قدم آگے نہ بڑھی اور نہ حفیظ صاحب کی بات بنا۔ آخر یہ دکان ایک بار پھر بک گئی ۔

ایک روز سننے میں آیا کہ بدایوں کے میر محفوظ علی کے صاحبزادے نے یہ دکان خرید لی۔ میر صاحب غالباً پولیس کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر آئے تھے ۔ دکان کیا چلاتے وہ تو یہ بھی ثابت نہ کر سکے کہ پولیس سے ریٹائر ہونے کے بعد کوئی کام بھی کر سکتا ہے ۔ شمشاد میں ہمیشہ ایک گروہ ان نوجوان لڑکوں کا رہا ہے جو بہ باطن تو اسکول میں پڑھتے ہیں لیکن ظاہر میں وہ شمشاد میں مارے مارے پھرتے ہیں اور ان میں بیشتر وہ لڑکے ہوتے ہیں جو یہیں کے رہنے والوں سے متعلق ہوتے ہیں اور ہر گھر کر اپنے ماں باپ کی نظروں کے سامنے رہتے ہیں ۔ ان نوجوانوں کو سفتے بھر بیٹھنے کے لیے جگہ کی تلاش ہوتی ہے ۔ میر صاحب نے دکان کیا کھولی، گویا ان کا مقدر رکھل گیا ۔ ادھر کچھ دکان کی قدر و قیمت نواب صاحب نے بڑھائی تھی جو کسر رہ گئی تھی ان لونڈوں نے پوری کر دی۔

میر صاحب بھی آخر کب تک گھر کا کھاتے ۔ ان سے بھی کام نہ ہو سکا اور ہوتے ہوتے یہ دکان اسد یار خاں کے ایک دوست کے ہاتھ آ گئی ۔ ان کے اصل نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں یونیورسٹی کے لڑکوں

کا دیا ہوا نام اس قابل نہیں کہ میں اسے یہاں نقل کر دوں۔ پھر یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ یہ سچ ہے کہ "نقل کفر کفر نہ باشد" لیکن دنیا والے تو کافر کہہ کر گردن مار دیتے ہیں اس لیے تفصیل میں جانے سے گریز کروں گا۔

اس کے بعد دکان ٹھیکے پر اٹھی اور ایک کے بجائے الگ الگ دو ہو گئیں اور روز بروز اس کے نت نئے نئے روپ سامنے آنے لگے۔ ہر سال یہاں ایک نہ ایک نئی دکان کا افتتاح ہو جاتا ہے۔ شمشاد کے من چلوں کو چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو مل جاتا۔ دو چار روز خوب ہڑ بونگ رہتی اور پھر سناٹا۔ اُن دکانوں نے نئے نئے نام اختیار کیے کبھی کہکشاں اسٹور ہوا تو کبھی کسی ڈرائی کلینر کا بورڈ نظر آیا۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اس دکان پر کسی بزرگ کی بد دعا ہے یہ کبھی نہ چلے گی۔ لیکن اب تو ایک طرف ہینڈلوم ہاؤس ہے اور دوسری طرف داڑھی والے اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔ رہا کاروبار کا چلانا نہ چلانا تو اللہ کے اختیار میں ہے، باقی انسان کی ہوس ہے دنیا میں کسے قیام۔ ہاں یہ جو ان سائن بورڈوں کی دنیا کو قیام رہے گا۔ ہر ایک کو ایک نہ ایک دن اپنی بولی بول کر اڑ جانا ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور شمشاد میں جو کوئی کاروبار شروع کرتا ہے اس پر چاہے کوئی بھی الزام لگ جائے لیکن بے صبری کا اس کے مزاج سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اب یہی دیکھیے کہ منظر جلیسری صاحب بار چھوڑے یہیں پڑے رہتے ہیں۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس اور مدراس ہینڈلوم ہاؤس کے بیچ میں جو جگہ خالی ہے اس کو آپ خالی نہ سمجھیے۔ یہی منظر صاحب کی دکان ہے۔ ویسے تو ایک چھوٹا سا بورڈ بھی دروازے پر چپکا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "یہاں ناول کرائے پر ملتے ہیں" لیکن سچ پوچھیے تو یہ منظر صاحب کی قیام گاہ ہے۔ میں جب سے اس علاقے میں آیا ہوں، منظر صاحب کو دیکھ رہا ہوں

شعر کہتے ہیں اور کسی نہ کسی ادبی و تہذیبی کام میں لگے رہتے ہیں۔ نمائش کا زمانہ آتا تو چند روز وہاں علم و ادب کی خدمت کرتے ہیں۔ جب تمنا فاروقی مرحوم کی صحت اچھی تھی اور رات کو ان کی بیٹھک میں محفل جمتی تھی تو منظر صاحب وہاں پابندی سے بیٹھتے تھے لیکن اب ان کی ضعیفی بھی ان کے چلنے پھرنے میں رکاوٹ بن گئی ہے۔

منظر صاحب کے زیر سایہ اسد یار خاں کی کتابوں کی دکان ہے۔ یہ بہت پرانی دکان ہے۔ علی گڑھ کے باہر ایجوکیشنل بک ہاؤس کے نام سے مشہور ہے لیکن شمشاد کے لڑکے تو اسے اسد بھائی کی دکان کہتے ہیں۔ اسد یار خاں اپنی ذات سے انجمن ہیں۔ کچھ لوگ ان کو کپتان صاحب بھی کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ یونیورسٹی کے رائڈنگ کلب کے کپتان تھے۔ ان کی رائڈنگ کی بھی بڑی دھوم تھی۔ ان کا اچھا خاصا اثر تھا۔ سننے میں تو یہاں تک آیا ہے کہ رائڈنگ کلب کا راستہ اسد یار خاں کی دکان سے ہو کر گزرتا ہے۔ حقیقت کچھ بھی ہو، لیکن یہ تو سولہ آنے نہیں بلکہ روپے میں سو پیسے کی طرح صحیح ہے کہ آج شمشاد کی عورتوں اور ان سے دس گنا بچوں کو ایک آسانی یہ ہے کہ جب بھی رائیڈنگ کلب کا کوئی فنکشن ہوتا ہے، ان کے نام کارڈ آجاتے ہیں اور اگر غلطی سے کسی کو کارڈ نہیں مل پاتا تو دن کے دن معذرت کے ساتھ دعوت نامہ ملتا ہے۔ اس طرح شمشاد کی ہر قسم والیوں کے لیے ذرا سی دیر کی تفریح کا انتظام ہو جاتا ہے اور کھانا پینا اس پر مستزاد۔

یہاں یہ بات بتا دینا بھی میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس فنکشن میں شمشاد والیوں کی حیثیت وی۔ آئی۔ پی کی ہوتی ہے۔

ابھی دو چار برس کی بات ہے کہ مولانا عشرت کا بڑا لڑکا مسعود بھی اسی اعزاز پر فائز رہا اور اس نے بھی اسد یار خاں کی روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس کو آگے بڑھایا۔ اور جب وہ شمشاد سے گھوڑے کو سرپٹ

دوڑا تے ہوئے نکلتے تو دو منزلہ پر رہنے والوں کی کھڑکیاں کھل جاتیں اور اگر ان کے دل کی دھڑکن کو آواز اور لاؤڈ اسپیکر کا تعاون حاصل ہوتا تو یہ آواز نکلتی ـــــ "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔"

مسعود نے غالباً یونیورسٹی چھوڑ دی ہے لیکن شمشاد میں وہ اب بھی دادِ تحسین وصول کرنے کے لیے موجود ہیں۔ اللہ انھیں یہ سعادت دے کہ وہ اپنے گھر والوں کے لیے ایک روز سہارا بنیں۔

شاید پہلے اسد یار خاں کا ذکر ہو رہا تھا جیسے انیسویں صدی کی آخری ۵ دہائیاں انگلستان میں ملکہ وکٹوریہ کا عہد کہلاتی ہیں۔ اسی طرح آج کے شمشاد کو ہم آسانی سے اسد یار خاں کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔

اسد یار خاں شمشاد کے اچھے بُرے کے برابر کے شریک ہیں۔ یہ نہیں کہ میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھو تھو۔ جب بھی کوئی چھوٹا موٹا جھگڑا ہوتا ہے تو فریقین پولس کے پاس جانے کے بجائے اسد یار خاں کے پاس جاتے ہیں۔ ویسے شمشاد میں پولس والے نظر نہیں آتے پراکٹر آفس کے بُل ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ یہ بُل ہمیشہ جھگڑوں سے دور رہنا پسند کرتے ہیں کیوں کہ جب کوئی جھگڑا ہوتا ہے تو بیچ بچاؤ کا کام دکاندار کرتے ہیں اور واردات ختم ہونے کے بعد یونیورسٹی بُل پھر اپنا پہرہ شروع کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی حادثہ ان کے سامنے بھی ہوتا ہے تو اس سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ ویسے بھی کسی کے جھگڑے میں پڑنا کون سی عقل مندی ہے۔ جس زمانے میں کسی جھگڑے فساد کا خطرہ ہوتا ہے تو گرد و نواح سے اسپیشل پولیس آجاتی ہے جسے لوگ پیار سے پی۔ اے۔ سی کہتے ہیں یعنی پی۔ اے۔ سی ایک قسم کی عارضی پولیس ہے جو مستقل طور پر علی گڑھ میں رہتی ہے۔ اگر آپ کو شام کے وقت کچہری بند ہونے کے بعد کچھ لوگ والی بال کھیلتے اور نقوی پارک کے سامنے ننگے بدن جنیو پہنے لوٹا ہاتھ میں لیے نظر آئیں تو سمجھ لیجیے کہ اسی کلب قسم

کی پولیس کی طرف میرا اشارہ ہے۔ ان کا تھوڑا بہت رشتہ شمشاد سے بھی ہے صبح صبح یہ لوگ قلعے کی طرف دوڑتے ہوئے شمشاد کی طرف سے گزرتے ہیں۔
جب کبھی کوئی غیر معمولی صورت شہر میں پیدا ہو جاتی ہے تو چار چھ آدمی لالہ کی دکان کے سامنے چارپائی پر بیٹھے چائے پیتے نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ یونیورسٹی کے آپسی جھگڑوں میں نہیں پڑتے چاہے چھریاں نکل آئیں یا پستول کیونکہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ پستول اور چھریاں محض ہاتھی کے دانت ہیں نیز یہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہی تو لڑکے ہیں جو کل کندھے سے کندھا ملا کر ان کے ساتھ چلیں گے۔ چنانچہ مستقبل کے ساتھیوں سے الجھنا کون سی شرافت ہے۔
لیکن جھگڑوں کو بنیادی طور پر چکانا اسد یار خاں کے ذمّے ہے۔ وہ یہ کام کرتے ہیں کبھی دھمکی سے، کبھی محبت سے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ کس کے لیے اپنے ترکش سے کون سا تیر نکالنا چاہیے۔ یونیورسٹی سے ام۔کام کر چکے ہیں۔ راقم الحروف کے شاگرد بھی رہ چکے ہیں لیکن کلاس میں شاذ و نادر ہی یہ سعادت حاصل ہوئی۔ مجھے بھی ان کے شاگرد ہونے کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ مجھے دیکھ کر سگریٹ پھینک دیتے ہیں اور کبھی کبھی اپنی انگلی بھی جلا لیتے ہیں۔ اگرچہ انھیں یونیورسٹی چھوڑے پندرہ سولہ سال ہو چکے ہیں، لیکن اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔
ایجوکیشنل بک ہاؤس، اسد یار خاں کے والد جناب عبدالشہید نے قائم کیا تھا۔ وہ عام طور پر درسی کتابوں کا کام کرتے تھے۔ اب اسد یار خاں نے عام ادبی کتابوں کی اشاعت بھی شروع کر دی ہے اور بعض بے حد خوبصورت کتابیں شائع کی ہیں۔ "کلیاتِ اقبال" کا صدی ایڈیشن جس اہتمام سے انھوں نے چھاپا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں چھپا۔ "الفاظ" کے نام سے اردو کا ایک جریدہ شائع کر رہے ہیں۔ غرض بڑی محنت سے بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔ جب کوئی اچھا کام کرنا چاہتے ہیں تو میرے پاس

مشورے کے لیے ضرور آتے ہیں ــــ اسدیار خاں، دکان کے بجائے اپنے دفتر میں بیٹھتے ہیں۔ دکان کی ذمہ داری احمد سعید کے سپرد ہے۔ احمد سعید ان کے چھوٹے بھائی ہیں مگر بڑی مستعدی سے کام کرتے ہیں اور ایک لمحے کے لیے دکان نہیں چھوڑتے اور شمشاد کی خبر رساں ایجنسی کا کام کرتے ہیں تاہم نام شمشاد میں اسدیار خاں کا چلتا ہے۔ شاید اسی لیے شیخ سعدی نے کہا تھا کہ "سگ باش برادر خورد مباش"

احمد سعید سے بڑے ڈاکٹر عارف محمد خاں ہیں۔ یونیورسٹی میں کامرس کے استاد ہیں اور شعبۂ تعلیم کے پروفیسر حبیب الرحمٰن مرحوم کی چھوٹی بیٹی سے شادی کے بعد رخصت ہو کر ان ہی کے ایک گھر میں منتقل ہو گئے ہیں ــــ دونوں میاں بیوی کھانے کے بے حد شوقین ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس کے لیے ان کو چین بھی جانا پڑے تو گریز نہ کریں گے بلکہ اسکوٹر پر بیٹھ جائیں گے۔ دونوں میاں بیوی راقم الحروف کے شاگرد رہ چکے ہیں اس لیے عید بقرعید سلام کرنے اور شیر کھانے پابندی سے آتے ہیں۔

شام کے وقت ایجوکیشنل بک ہاؤس کے سامنے چند حضرات پابندی سے نظر آتے ہیں ان میں پروفیسر حفیظ الرحمٰن کے صاحبزادے محمد فاروق، مولانا ضیا احمد بدایونی کے صاحبزادے میکش بدایونی، شعبۂ دینیات کے استاد محمد اقبال صاحب قابل ذکر ہیں۔

میکش صاحب دلوان ہیں۔ پچھلے سال ان کا مجموعہ کلام "میکدہ" ایجوکیشنل بک ہاؤس سے بڑے اہتمام سے شائع ہوا ہے میکش صاحب بڑی پابندی سے شمشاد آتے ہیں۔ اگر وہ کسی دن یہاں نہ آئیں تو ان کا کھانا ہضم نہ ہو۔ ویسے میرا خیال ہے کہ وہ بلا وجہ بھی یہاں نہیں آتے۔ مجھے کبھی یہاں نظر آتے ہیں تو چھڑی سے شمشاد کی مٹی کرید تے ہوئے جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈ رہے ہوں۔ بجا طور پر اسدیار خاں انھیں ہند و پاک

و بنگلہ دلیش کا ممتاز شاعر کہتے ہیں۔ اس کے پیچھے ان کی کاروباری واشتہاری ذہنیت بھی کام کرتی ہوگی، لیکن میکش کے خوشگو ہونے میں کوئی شبہ بھی نہیں ہے۔

اسد صاحب جہاں ان کو خوشگو تسلیم کرتے ہیں وہاں ان کی خوش بختی پر رشک بھی کرتے ہیں کہ وہ صحیح معنوں میں شاعر ہیں اور انھیں اپنی روزی روٹی کے لیے کوئی مشقت نہیں کرنا پڑتی اور اپنی زندگی "ہول ٹائم" شاعر کی حیثیت سے گزار رہے ہیں۔ پہلے ان کے باپ اپنے بیٹے بہو اور بچوں کی کفالت کرتے رہے اور پھر جب ان کا اپنا بیٹا اچھے منصب پہ پہنچ گیا تو پھر میکش صاحب کو محنت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تاہم زندگی میں بہت ہی شاذ ایسے واقعات سننے میں آسکتے ہیں کہ پہلے باپ کفیل پھر بیٹا اپنے فرائض انجام دے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ میکش بدایونی، مٹھائی کھاتے، شعر کہتے، اپنے شاگردوں کے کلام کی اصلاح کرتے، چھڑی گھماتے شمشاد میں پھرتے ہیں اور آزادانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ قابل رشک ہیں ایسے لوگ کہ جن کو کسی کے سامنے سرِ نیاز نہیں جھکانا پڑا۔ اور شاید ان کو خوشگوئی کا راز بھی یہی ہے۔

اقبال صاحب اور میکش بدایونی اگرچہ شمشاد میں نہیں رہتے لیکن شمشاد کی زندگی میں برابر رنگ بھرتے رہتے ہیں۔ خدا ان تمام حضرات کو سلامت رکھے کہ ان سے تہذیب کو فروغ ہوتا ہے۔

اسد یار خاں کی دکان سے ملی ہوئی صغیر صاحب کی دکان ہے جس پر ان کے چھوٹے لڑکے کام کرتے ہیں۔ یہ ڈرائی کلیننگ کی دکان ہے۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ جو دکان خالی ہوتی یہی سننے میں آتا کہ صغیر صاحب کے بیٹوں میں سے کوئی نہ کوئی سودا کر رہا ہے۔ ان کی پبلسٹی بھی کچھ زیادہ ہی ہوئی جب کوئی نئی دکان لیتے اس کا باقاعدہ افتتاح کرتے۔ کچھ دنوں تک

تو یہی سننے میں آتا کہ دکان بہت زور شور سے چل رہی ہے میرے لڑکے کا تو یہ خیال
تھا کہ ان میں تجارتی سوجھ بوجھ اتنی ہے کہ آمدنی سے زیادہ منافع ہو رہا ہوگا
پھر دھیرے دھیرے سننے میں آتا کہ دکان بکنے والی ہے۔ دراصل یہ راز تو
بہت دنوں کے بعد کھلا کہ جن لوگوں کو سب خریدار سمجھتے تھے وہ احباب
نکلے۔ بہرحال مخلص اتنے مخلص تھے کہ جہاں ان کا پسینہ ٹپکے وہاں اپنا خون
بہانے کو تیار رہتے۔

اس سے شمشاد کو ایک خاص فائدہ یہ بھی ہوا کہ میر صاحب کی دکان
کے خاتمے کے بعد وہ لڑکے جو مارے مارے پھرتے تھے اور ان کے پاس
کوئی کام نہ تھا، ان کو بیٹھنے کے لیے ایک معقول جگہ مل گئی۔ بہرحال کاروبار
تو لوگوں کے چلتے ہی ہیں۔ یہ بھی بڑی خدمت ہے "کسب کمال کن کہ عزیز
جہاں شوی"۔

ڈرائی کلیننگ کی دکان کے بعد پھاٹک ہے، اور حامد علی بلڈنگ
کا ایک حصہ یہاں ختم ہوتا ہے اور پھاٹک سے دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے
کونے کی دکان پر تا دم تحریر ایک فرنیچر کی دکان ہے پہلے ایک درزی
کی دکان تھی جو کام تو کم کرتے تھے لیکن پھاٹک میں پیشاب کرتے زیادہ
نظر آتے تھے۔ جب دیکھیے لوٹا لیے کمربند کھول رہے ہیں۔ ابھی حال ہی
میں انھوں نے دکان کے بوجھ سے اپنے آپ کو سبکدوش کیا ہے خدا
کرے کہ یہ فرنیچر والے ان ٹیلر ماسٹر کی جگہ نہ لے لیں۔ البتہ میں یہ بھی
سوچتا ہوں کہ ٹیلر ماسٹر صاحب نے کاروبار ادھر کہیں کر لیا ہوگا، لیکن
پیشاب کے لیے ان کے نزدیک ایک معقول جگہ ان کے ہاتھ سے جاتی رہی

ٹیلر ماسٹر کے قائم مقام فرنیچر والے ہیں۔ ان کے بالکل پڑوس میں ان کے
کے لڑکے شمشیر کی جنرل مرچنٹ کی دکان ہے۔ اچھی خاصی چلتی ہے۔ انھیں کوئی
شکایت بھی نہیں ہے۔ ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان ہی کے

گاہک ہیں، اسی لیے ان کا اپنے مزے کا کام ہے۔ جیا رضا صاحب کی سی مصروفیت تو نہیں ہے اور یہ اچھا بھی ہے۔ اس لیے کہ انھیں تجارت سے زیادہ بینڈ بجانے کا شوق ہے۔ غالباً دن بھر بجاتے ہوں گے، لیکن لاؤڈ اسپیکر کے شور میں ان کی آواز نہیں سنائی دیتی۔ جب لاؤڈ اسپیکر کی آواز بند ہوتی ہے تو پھر بینجو کی مدھم مدھم آواز شمشاد میں گونجتی ہے اور اس سناٹے سے برسرِ آزما ہوتی ہے۔ ٹیگور نے لکھا ہے ؎

"ڈوبتا ہوا سورج پوچھتا ہے کون ہے جو میری جگہ لے گا؟" — مٹی کا دیا جس میں ابھی کچھ تیل باقی تھا کہتا ہے

"میں کوشش کروں گا۔"

شمشیر کی دکان سے ملی ہوئی نقلی رضا کی دکان ہے۔ یہ دکان عام طور پر بند رہتی ہے۔ شاید کسی بڑے گاہک کا انتظار رہے۔

خدا جانے کیا بات ہے کہ نقلی رضا کا کاروبار کبھی پنپ نہ سکا۔ انھوں نے اس دکان میں ان گنت کاروبار کیے۔ کبھی یہ دکان گھڑی کی دکان بن گئی تو کبھی فاؤنٹن پین کی دکان۔ کبھی اس کے سامنے سائکلیں کرائے پر دی جانے لگیں تو کبھی اصلی گا رنٹی کا گھی ملنے لگا۔ ویسے محرم کا تعزیہ کسی حد تک مستقل حیثیت رکھتا ہے یعنی چند روز کے لیے۔ یہ تعزیہ محرم کے دنوں میں اس دکان کی طرف اپنے عقیدت مندوں اور بچوں کو کھینچتا ہے۔ چند روز کے لیے نقلی رضا کی دکان میں رونق ہو جاتی ہے۔ ایک زمانہ ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اس چھوٹی سی دکان کے سامنے بڑی پرانی پرانی موٹریں نظر آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ اب چھوٹی چھوٹی گھڑیوں کے بجائے بڑی بڑی موٹروں کی مرمت ہوتی ہے۔

نقلی رضا بنیادی طور پر بزنس مین ہیں۔ ان کے لیے کسی مخصوص کاروبار کی شرط نہیں، وہ ہر کاروبار کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اس کا

ثبوت بھی دیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی کاروبار زیادہ دنوں نہیں چلا۔ لیکن ان کا کام کاروبار کرنا ہے۔ تقدیر سے کشتی لڑنا تو نہیں۔

مجھے فاؤنٹین پین کا شوق ہے، اور کبھی کبھی اس کی مرمت کے سلسلے میں ان سے رجوع کرنا پڑا لیکن ان کی دکان کھلی ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ قادر کی دکان پر نظر آتے ہیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے یہ کام کر دیتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ دوسرے کی دکان میں، اپنی دکان میں نہیں۔

میں نے بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی کہ ایک بطخ روزانہ سونے کا انڈا دیا کرتی تھی۔ ایک دن مالک سے صبر نہ ہو سکا، اس نے سوچا کیوں نہ میں اکٹھا سارے انڈے نکال لوں۔ روز روز کے انتظار سے تو جان چھوٹے گی۔ ایک دن اس نے بطخ کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ لیکن وہاں صرف ایک انڈا نکلا۔

شمشاد میں ایسے کاروبار کرنے والے بھی آپ کو مل جائیں گے جو ایک روز میں سارا منافع وصول کرنا چاہتے ہیں۔

یہ کہانی مجھے یوں ہی یاد آگئی۔ مجھے یہ کہانی بہت پسند ہے اسی لیے سوچا کہ لگے ہاتھوں آپ کو بھی سنا دوں بقول غالب ؏ روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ۔

نقی رضا کے بیان میں قادر کا بھی نام آگیا۔ لگے ہاتھوں ان کے بارے میں بھی آپ کو بتا دوں۔ شمشاد میں ٹی ہاؤس کے پاس ہی قادر کی بھی ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ قادر پہلے جبار صاحب کی دکان میں کام کرتے تھے۔ ان کی حیثیت جبار صاحب کے یہاں دہی تھی جو اسپ معشوق علی کی ہے۔ جس طرح معشوق علی خندہ پیشانی سے ہر گاہک کا استقبال کرتے ہیں، ان کا حساب کتاب رکھتے ہیں اور اس کے علاوہ جبار صاحب کے سکریٹری کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ ساری ذمہ داریاں پہلے قادر کے سپرد تھیں۔ جبار صاحب اور قادر ایک جان دو قالب تھے پھر ایک روز معلوم ہوا کہ قادر الگ ہو گئے انھوں نے

اپنی ایک دکان ٹی ہاؤس کے پاس کھول لی یہ بھی دکان کیا ہے۔ چائے خانے کے دروازے سے ملا کر ایک تخت بچھالیا ہے اور اس کو کچھ اس طرح سجایا ہے کہ اچھی خاصی دکان معلوم ہوتی ہے اور یہ تختہ بظاہر جتنا کمزور ہے باطن میں اتنا ہی مضبوط ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ قادر جیسے لحیم شحیم آدمی اس پر براجمان رہتے ہیں لیکن اس میں لچک تک پیدا نہیں ہوتی ہو سکتا ہے کہ انسانوں کی طرح بعض لکڑی کے تختے ایسے ہوں جو لچکتے نہ ہوں لیکن ٹوٹ جاتے ہوں۔ لیکن ابھی تک تو اس کے ٹوٹنے کی کبھی کوئی خبر سننے میں نہیں آئی۔

قادر چھوٹے موٹے انجینیر ہیں۔ سول کے بارے میں تو میں جانتا نہیں لیکن ان کے الیکٹریکل اور میکینیکل انجنیر ہونے میں کوئی شبہ نہیں کر سکتا۔ وہ عام بجلی کے کام جانتے ہیں پنکھوں کی مرمت کر لیتے ہیں۔ اسٹو و بھی ٹھیک کر لیتے ہیں۔ اگر فاؤنٹین پن کی کوئی خرابی ہو تو وہ بھی دور کر لیتے ہیں۔ ان کے علاوہ ٹارچ کے کام میں تو شمشاد میں ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ البتہ قلم کے معاملے میں جب کوئی سیریس کیس آجاتا ہے تو نقی رضا سے رجوع کر لیتے ہیں۔ نقی رضا کے ان سے پرانے مراسم ہیں۔ وہ ہر موسم میں ان کے پاس پابندی سے بیٹھتے ہیں جس زمانے میں نقی رضا کی اپنی دکان بند ہوتی ہے اس زمانے میں تو وہ بیٹھتے ہی ہیں لیکن جب اپنی دکان کھول لیتے ہیں تب بھی اپنی دکان میں کم اور قادر کی دکان پر زیادہ بیٹھتے ہیں۔ ایسے دوست روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

قادر کے اپنے مخصوص گاہک ہیں، یہ گاہک اتنی تعداد میں ہیں کہ ان کا کام اچھا چل جاتا ہے۔ بڑی محبت کے آدمی ہیں، اپنے گاہکوں کا ہی نہیں آس پاس کے لوگوں کا بھی خیال رکھتے ہیں۔

ایک بات ان تمام دکانداروں کے بارے میں عام ہے کہ یہ سب چائے کے شوقین ہیں۔ اور شمشاد کے علاوہ انھیں اور کہیں کی چائے پسند نہیں۔ میرا خیال ہے کہ شمشاد کے چائے خانوں کی کامیابی کا راز بھی یہی دکاندار رہیں۔

ہر دکاندار چائے کا شوقین ہے اور ہر ایک ان میں سے اگر ایک چائے خانے کی سرپرستی کرے تو اس چائے خانے کی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں رہے گا۔

شمشاد میں جہاں نقی رضا جیسے بزنس مین ہیں، جن کا کاروبار بار بار دھکا دینے کے باوجود نہیں چلا وہاں آپ کو غفور میاں بھی ملیں گے۔ غفور میاں، جن کو ان کی داڑھی کی وجہ سے بہت سے طالب علم مولانا غفور بھی کہتے ہیں۔ داڑھی کی وجہ سے ان میں ایک قسم کی خود اعتمادی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ بڑے سلیقے سے شین قاف نکالتے ہیں۔ ان کی حیثیت بھی شمشاد کے چھوٹے موٹے لیڈر کی سی ہے۔ اگر ان کو کوئی ذمہ داری سپرد کر دی جائے تو بڑے سلیقہ سے نباہتے ہیں۔

غفور میاں نے کچھ دنوں انجمن ترقی اردو ہند کے صدر دفتر میں بھی ملازمت کی۔ لیکن انھوں نے شادی اس وقت کی تھی جب فیملی پلاننگ کا کوئی چرچا نہ تھا اس لیے انجمن ترقی اردو کی قلیل تنخواہ پر اپنے بال بچوں کا پیٹ نہ بھر سکتے تھے، انھوں نے بہت جلد یہ ملازمت چھوڑ دی۔ یہ زمانہ خربوزوں کی فصل کا تھا۔ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ غفور میاں زمین پر خربوزوں کا ڈھیر لگائے دو آنے سیر۔ دو آنے سیر چلاّ رہے ہیں۔ اس میں کچھ تو منافع نے حوصلہ افزائی کی اور باقی کسر، جو اس عمل میں مزا آیا، اس سے پوری ہوئی۔ اب تو بشیر صاحب کی دکان کے سامنے ان کا خربوزوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا، لوگ جوق در جوق آتے تھے۔ غفور میاں میٹھے بول کے عادی ہیں اس نے اور سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ بشیر صاحب فرینڈس بک ہاؤس کے اندر بیٹھنے کے بجائے کرسی بچھا کر باہر بیٹھنے لگے۔ حسب اشتہا خربوزے بھی کھاتے تھے اور جب غفور میاں کو کاروبار سے فرصت ملتی تو ان سے باتیں بھی کرتے تھے۔

جب خربوزوں کی فصل ختم ہوئی تو آم کی فصل شروع ہو گئی۔ غفور میاں

کوئی خریدار کے نوکر تو تھے نہیں آم بیچنے لگے۔ غرض ۔۔۔ چلیے اس طرف کو ہوا ہو جدھر کی۔ بہت دنوں موسموں اور فصلوں نے ساتھ دیا۔ چھوٹے موٹے کئی کام کیے اور سب ہی سے انھیں اچھا خاصا بچنے لگا اور آخر میں ایک ہوٹل کے پاس دکان کھول لی۔ کباب اور بند کی۔ یہ دکان بھی چل پڑی۔ ان کی دکان زیادہ تر رات کو چلتی ہے۔ چائے بھی بناتے ہیں۔

دراصل اس میں منافع کو اتنا دخل نہیں جتنا اس بات کا خیال تھا کہ یونیورسٹی کے پڑھنے لکھنے والے لڑکوں کو رات کو چائے کی تکلیف ہوتی ہے۔ رات کا کوئی حصہ ہو ان کی دکان پر رونق رہتی ہے۔ بہرحال دکان چل پڑی۔ ہوسٹل کے لڑکے ان کے خاص گاہک ہیں۔ آفتاب ہال کے مختلف ہوسٹلوں کے لڑکے آنکھیں ملتے ہوئے آتے ہیں اور ان کی چائے پی کر واپس جاتے ہیں۔

غفور میاں کو اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ ان کی بدولت لڑکوں کو رات کو چائے مل جاتی ہے جب سارا شمشاد سوتا ہے تو وہ جاگتے اور اپنا کام کرتے ہیں۔ کبھی کبھی دوسرے بھی ان کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں لیکن بقول نادری

شعر: یہاں جب شام ہو جاتی ہے تو سورج نکلتا ہے۔

غفور میاں کو بند میں کباب رکھ کر بیچنے میں خاص مہارت حاصل ہے۔ میں نے کبھی انھیں زمانے کی شکایت کرتے نہیں سنا۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ ان کی دکان یا ہوٹل یا کیفے کا کوئی نام نہیں ہے۔ آئیے سہولت کے لیے اسے "کیفے دے بے سراغ" کا نام دے دیں۔ چاہے لڑکے اس کو غفور میاں کا ہوٹل ہی کیوں نہ کہیں۔ کچھ ان کے اخلاق اور باقی ان کی ذاتی نیکی کی وجہ سے مارکیٹ کے لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔ اسماعیلیہ بلڈنگ جہاں ختم ہوتی ہے اس کے بعد گلی ہے اور گلی کے دوسری طرف غفور میاں اپنا کام ۔۔۔ آرام سے شاہراہ عام سے ہٹ کر چلاتے ہیں۔ جب میں یہ سطور لکھ چکا تو معلوم ہوا کہ بے نام ہوٹل کی شرمندگی مٹانے کے لیے

انھوں نے اس کا نام "غریب نواز" رکھ لیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ لڑکے اسے غفو میاں کا ہوٹل ہی کہیں گے۔ حالانکہ یہ نام ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔)

اسماعیلیہ بلڈنگ کی سب سے اہم اور شاندار دکان فرینڈس بک ہاؤس کی ہے۔ یہ دیکھنے میں یہاں کی سب سے بڑی کتابوں کی دکان ہے۔ کسی زمانے میں یعنی آزادی سے پہلے "ارشاد بک ڈپو" تھا۔ ارشاد بک ڈپو والے اسے بشیر صاحب کے ہاتھ فروخت کر دیا اور منھ اٹھا کر پاکستان چلے گئے۔

میں ارشاد صاحب کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ میری طالب علمی کے زمانے کا واقعہ ہے۔ ۱۹۴۳ء کا ــــ میں نے کلکتہ سے کچھ کتابیں منگوائی تھیں۔ روپیہ پہلے منی آرڈر کر دیا۔ لیکن کتابیں نہیں آئیں۔ جب میں نے ڈاک خانے میں شکایت کی تو پتا چلا کہ غلطی سے بنڈل میرے بجائے ارشاد صاحب کی دکان میں چلا گیا۔ پوسٹ مین کی بھی کیا غلطی۔ وہ سمجھا کہ یہ کتابیں کسی بک سیلر نے منگائی ہوں گی۔ چنانچہ وہ غریب یہ بنڈل ان کی دکان پر دے آیا۔ میری شکایت پر پوسٹ مین سے سخت باز پرس ہوئی۔ یہ زمانہ تھا کہ جب ڈاک خانے میں پبلک کی ذرا سی شکایت بھی متعلق کارکن کے لیے مصیبت بن جاتی تھی۔ مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔ پوسٹ مین میرے پاس دوڑا دوڑا آیا۔ یہاں ایک بات اور بتا دوں۔ علی گڑھ کے پوسٹ مین دوسری جگہ کے ڈاکیوں سے بہت مختلف ہوتے تھے اور یونیورسٹی کے طالب علموں سے بڑی تہذیب سے باتیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ یہ علم و تہذیب کا ادارہ ہے یہاں علم کو سیکھنا اور تہذیب کے دامن کو مضبوطی سے پکڑنا ضروری ہے اور اب تو شاید یہ بات طالب علم بھی بھول گئے ہیں۔ ہاں تو یہاں کے پوسٹ مین بھی زبان اور لہجے کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ اگر آپ کا خط نہ آئے تو یہ نہیں کہتے

کہ آپ کا کوئی خط نہیں آیا بلکہ آپ سے مخاطب ہو کر بڑے ادب سے کہیں گے "میاں آپ کے گھر سب خیریت سے ہیں، پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے"۔

اور جب انتظار کے بعد خط دیتے تھے تو کہتے تھے کہ "میاں! خدا کرے آپ کے گھر سے اچھی خبر آئی ہو"۔ اور بہت مسکرا کر خط حوالے کرتے تھے۔ میں نے اپنی طالب علمی کے چار برسوں میں یہ کبھی نہیں دیکھا کہ کسی پوسٹ مین نے ہاتھ میں خط دینے کے بجائے دور سے پھینکا ہو۔

۹۔ اگست سنہ ۴۲ء کا ہنگامہ تھا۔ منی آرڈروں اور خطوں کا آنا جانا تقریباً بند ہو گیا تھا۔ کتنے پوسٹ مینوں نے لڑکوں کو محسوس نہ ہونے دیا کہ ان کے منی آرڈر نہیں آئے۔ انھوں نے اپنے پاس سے روپے دے دیے اور کہا کہ "فارم ڈاکخانے میں بھول آئے۔ آپ بھی یہیں ہیں، میں بھی یہیں ہوں، کبھی بھی دستخط کرا لوں گا۔ یہ ڈاکیے کوئی گھر کے رئیس نہ تھے۔ تنخواہ کے علاوہ جو انعام لڑکے دے دیا کرتے تھے یہی ان کی بالائی تھی۔ انعام کا معاملہ بھی یہ تھا کہ لڑکے صرف منی آرڈر پر بخشش نہیں دیتے تھے بلکہ اگر کوئی "اچھا" خط مل جاتا تھا تو جی کھول کر بخشش دیتے تھے۔ ویسے عام طور پر لڑکے بھی خوشحال گھرانے کے ہی علی گڑھ میں آتے تھے لیکن اس میں محض خوشحالی کی بات نہ تھی، دلوں کی وسعت بھی اپنا کام کرتی تھی۔

یہی نہیں طالب علم امتحان کے بعد جب گھر جاتے تو یہ پوسٹ مین ان کے رول نمبر لے لیتے اور تار سے مبارکباد کا پیغام اور نتیجہ بھیجتے۔ چنانچہ جب لڑکے یونیورسٹی آتے تو اپنے گھر سے ان کے لیے خصوصی انعام لے کر آتے۔ یہ لڑکوں سے محبت کرتے اور انھیں شدت سے اس کا احساس رہتا تھا کہ یہ لڑکے اپنے ماں باپ بہن بھائیوں سے دور ہیں اور ان کے خطوں کے لیے ان کی راہ تکتے ہیں۔ اس لیے یہ ذرا سا قت،

کبھی ضائع نہ کرتے ۔ ہم لوگ ان کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں درست کیا کرتے تھے ۔

یہ پوسٹ مین طالب علموں سے محبت کرتے اور اس کا انعام پاتے، اور ہمیشہ خندہ پیشانی سے باتیں کرتے ۔ اب تو ڈاک ہوائی جہاز سے بھی آنے لگی ہے لیکن پھر بھی مکتوب الیہ تک پہنچنے میں اس سے زیادہ وقت لگتا ہے ۔ اب ڈاک کی شکایت کریں تو فغانِ درویش کا احساس ہوتا ہے ۔

ہاں تو اپنی شکایت کا واقعہ سنا رہا تھا کہ میں نے جب ڈاکخانے میں اپنی کتابیں نہ ملنے کی شکایت کی تو متعلق پوسٹ مین پریشانی میں مبتلا ہو گیا ۔ چنانچہ میں نے اپنی شکایت واپس لے لی ۔ یہ اور بات ہے کہ ارشاد صاحب نے مجھے کتابیں واپس کیں اور نہ ان کے دام دیے ۔ لیکن اس کا فرینڈ بک ہاؤس کے بشیر صاحب سے کوئی تعلق نہیں ۔ بشیر صاحب نے کاروبار کو بڑے سلیقے سے چلایا لیکن پھر زوال آنا شروع ہو گیا ۔ انھوں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا، اس میں گھاٹا ہوا ، کتاب چھاپی، وہ چھپنے کے ایک ہفتہ کے اندر کورس سے نکل گئی ۔ آج کل لڑکے کتابیں کہاں خریدتے ہیں ! جو پیسے کتابیں خریدنے کے لیے آتے ہیں انھیں سنیما اور چائے میں ختم کر دیتے ہیں ۔ اور لائبریری کی کتابوں سے کام چلا لیتے ہیں ، جب سے یونیورسٹی میں سمسٹر سسٹم شروع ہوا ہے بشیر صاحب کے بقول اب تو اور بھی نہیں بکتیں ۔ عام طور پر لڑکے نوٹس کی تلاش میں رہتے ہیں اور نوٹس کا معاملہ بھی یہ ہے کہ کسی دو یونیورسٹیوں کا نصاب یکساں نہیں اور نصاب بھی آئے دن بدلتے رہتے ہیں ۔ اب نوٹس چھاپے جائیں تو کیسے ۔ یونیورسٹی کی مختلف لائبریریاں کتابیں خریدتی ہیں ، خریدتی کیا ہیں ، کتابوں کے ساتھ بل لیتی ہیں اور بل کی ادائیگی مہینوں کیا برسوں میں ہوتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ بشیر صاحب کس طرح لائبریری کو کتابیں

اسپلائی کریں۔

یہ تو خدا کا شکر ہے کہ انھیں گرلز کالج میں ایک گوشہ مل گیا ہے جہاں انھوں نے ایک چھوٹی سی دکان کھول لی ہے۔ یہاں لڑکیوں کی ضرورت کی اور چیزیں بھی ملتی ہیں۔ بشیر صاحب کو گرلز کالج کی لڑکیاں بھائی میاں کہتی ہیں اور بشیر صاحب سے کتابوں کے علاوہ اور چیزیں بھی خریدتی رہتی ہیں۔ چنانچہ وہ گرلز کالج میں بک سیلر کے ساتھ ساتھ جنرل مرچنٹ کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ غرض بشیر صاحب کی قلندرانہ زندگی کسی نہ کسی طرح چل رہی ہے۔

آخر آخر میں "فرہنگ ہفت زبان" کا کام شروع کیا۔ اس میں بیس پچیس ہزار روپے لگا کر بیٹھ گئے۔ وزیر تعلیم ڈاکٹر نورالحسن صاحب کو ہمدردی ہوئی۔ انھوں نے کہا حکومت ایسے کام میں اسی وقت مدد کر سکتی ہے جب اسے کوئی رجسٹرڈ سوسائٹی کرے۔ بشیر صاحب نے یونیورسٹی کے استادوں کی مدد سے ایک سوسائٹی بنائی اسے رجسٹرڈ کرایا۔ اپنا یہ سارا کام جس کا ایک خاصا حصہ چھپ چکا تھا اس سوسائٹی کے سپرد کر دیا۔ اس سلسلے میں میں نے بھی بڑی کوشش کی کہ حکومت کچھ مدد کرے اور بشیر صاحب کا روپیا واپس ہو جائے پھر سوسائٹی خود اس کام کو چلائے، لیکن کامیابی نہ ہو سکی بشیر صاحب مقروض کے مقروض رہے۔ میں کیا کر سکتا تھا، مدد ہی کر سکتا تھا کسی کی تقدیر سے لڑنا میرے بس میں نہیں۔

الغرض اب فرینڈس بک ہاؤس اپنے نام کی لاج رکھ رہا ہے اور سچ پوچھیے تو "بک" بلاوجہ ہے بشیر صاحب کی دکان فرینڈس ہاؤس ہے جہاں شام کو چند احباب مل بیٹھتے ہیں۔ چائے اور پان اس دکان کا لازمی حصہ ہیں۔ لیکن یہاں مہمانوں کی فصل سے بھی خاطر کی جاتی ہے۔ نسیم قریشی صاحب، امین اشرف، ڈاکٹر مسعود عالم، عرفانی صاحب یہاں برابر

آتے رہتے ہیں اور اپنی حاضری لگا جاتے ہیں۔ نسیم صاحب بڑی شان سے شمشاد میں ٹہلنے نکلتے ہیں۔ نسیم صاحب یوں تو مجرد زندگی گزارتے ہیں، لیکن انھیں شاید ہی کسی نے کبھی اکیلے دیکھا ہوگا۔ جب وہ شمشاد میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے دائیں بائیں، دو چار آدمی ضرور رہتے ہیں۔ وہ جب آفتاب منزل سے امین اشرف، میکش بدایونی، مسعود عالم یا اور کسی کے ساتھ نکلتے ہیں تو پہلے ہی یہ شرط طے کر لیتے ہیں کہ لالہ کی دکان پر مٹھائی نہیں کھائیں گے اور بشیر صاحب کی دکان پر آکر اپنی شرط کا اعادہ کرتے ہیں۔ لیکن لالہ کی دکان پر پہنچتے پہنچتے ان کا ارادہ متزلزل ہو جاتا ہے اور ذرا سی دیر میں وہ لالہ کی دکان میں مٹھائی کھاتے نظر آتے ہیں۔ نسیم صاحب کو صرف تین چیزوں کا شوق ہے۔ اچھے کھانے کا، پان کھانے کا اور قوالی سننے کا۔ اور بفضلہ تعالیٰ یہ چیزیں حسب ضرورت موجود ہیں۔

شام کو جب نسیم صاحب شمشاد میں داخل ہوتے ہیں تو اکدم سے جیسے رونق ہو جاتی ہے اور وہ بھی اسی طرح گزرتے ہیں جیسے یہ کوئی بازار نہیں ہو ان کی کرامت ہے۔ اللہ کرے کہ یہ کرامت دلوں دن قائم رہے۔

آفتاب منزل میں ہی کشن سنگھ بھی رہتے ہیں۔ کشن سنگھ بشیر صاحب کے بڑے اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ کشن سنگھ کا شمشاد سے کوئی رسمی رشتہ نہیں ہے مگر میں غیر رسمی طور پر ان کو شمشاد ہی کا ایک رکن سمجھتا ہوں۔ وہ ایک زمانے میں کمیونسٹ پارٹی کی کتابوں کی دکان "نیا کتاب گھر" کے مینیجر تھے پھر کمیونسٹ پارٹی اس دکان سے دستبردار ہوگئی اور کشن سنگھ اس دکان کے باقاعدہ مالک ہو گئے۔ نیا کے بجائے "نیو کتاب گھر" ہوگیا۔ یہ دکان "صاحب باغ" کے پھاٹک کے سامنے ہے۔ دکان کیسی چلتی ہے اس کے بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں لیکن کشن سنگھ کو خوب جانتا ہوں۔ وہ دکاندار کم، سیاسی آدمی زیادہ ہیں۔ ان کی بیوی وسیمہ انصاری خود بہت اچھی سماجی کارکن ہیں جب بھی شمشاد

پر کوئی وقت پڑا یہ دونوں میاں بیوی نکل پڑے اور خاموش خدمت کا حق ادا کیا۔ پچھلے فساد میں جو سن ۱۹۷۰ء میں ہوا تھا۔ دونوں میاں بیوی نے غریب مسلمانوں کے گھروں میں جا جا کر آٹا دال تقسیم کیا۔ ایسے لوگ کتنے ہوتے ہیں جو دوسروں کے کام آکر خوش ہوتے ہیں۔ بلاشبہ کشن سنگھ کا قلب مومن کا قلب ہے اور مجھے تو ان کا دماغ بھی کافر نہیں معلوم ہوتا۔

کشن سنگھ، بشیر صاحب کے دوست ہیں۔ بشیر صاحب اور تو کچھ کر نہیں سکتے البتہ اپنے اسکوٹر کے بس بھر وہ بھی کوئی نہ کوئی سوشل کام کر دیتے ہیں اور اس طرح شہیدوں میں اپنی گنتی کروا لیتے ہیں۔

بشیر صاحب اور کشن سنگھ کی دوستی ہندو مسلم اتحاد کا بہترین نمونہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھتے ہیں اور یہی ضروری ہے۔

بہت پرانی بات ہے۔ ہماری دادی سنایا کرتی تھیں۔ ہم الہ آباد میں رہتے تھے۔ اب سے غالباً پچاس ساٹھ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ہمارے پڑوس میں ایک لالہ رہتے تھے ان کی ہمارے دادا سے بڑی گہری دوستی تھی۔ ایک بار نہ جانے کس سلسلے میں ہمارے یہاں دعوت ہوئی۔ ہندوؤں کے لیے الگ انتظام تھا اور مسلمانوں کے لیے الگ۔ لالہ کے بڑے لڑکے ہمارے چچا کے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے دسترخوان پر بیٹھ گئے اور بڑے مزے میں گوشت کھانے لگے۔ ذرا سی دیر میں ہمارے دادا کی ان پر نظر پڑی انھوں نے لپک کر ان کو پکڑ لیا اور ایک تھپڑ جمایا۔ "تم کو شرم نہیں آتی، گوشت کھاتے ہو۔" صاحبزادے چپ چاپ اٹھ کھڑے ہوتے اور انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ کھانا کھایا۔" میں نے دادی سے پوچھا" انھوں نے ایسا کیوں کیا؟"

دادی نے کہا" ایسا کیوں نہ کرتے۔ اگر فرض کرلو تمھارے چچا کوئی حرام چیز کھائیں پییں اور لالہ جی دیکھ لیں تو کیا پڑوسی اور دوست کے ناتے ان کا فرض نہیں ہے کہ ان کو سزا دیں؟"

میں نے کہا "لیکن گوشت تو کھانے کی چیز ہے۔"
کہنے لگیں۔ لیکن ہندوؤں کے یہاں گوشت کھانا اچھا نہیں سمجھا جاتا اس لیے پڑوسی کے رشتے ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم لالہ کی اولاد کا خیال رکھیں" ہاں تو بشیر صاحب اور کشن سنگھ کی دوستی کچھ ایسی ہی ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔

وسیمہ انصاری بڑی اچھی سوشل ورکر ہیں ان کے بھائی ڈاکٹر نسیم انصاری بہت اچھے سرجن ہیں کہتے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں شفا ہے۔ شاید نام کا اثر ہے۔ ان کا علمائے فرنگی محل سے تعلق ہے۔ یونیورسٹی میں انھوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور بہت جلد وی۔ آئی۔ پی ڈاکٹر بن گئے۔ یہی علی گڑھ میں ایک ڈاکٹر کی معراج ہے۔ تاہم راقم الحروف سے بہت محبت سے ملتے ہیں۔ لکھنؤ کے اخلاق کا نمونہ ہیں۔ پچھلے دنوں لڑکے ان سے کسی بات پر ناراض ہو گئے تھے بڑی تلخی پیدا ہوئی۔ رائی کا پربت بناتے ہم نے بہت سنا ہے لیکن علی گڑھ میں پربت بنانے کے لیے رائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہاں تو ان کے خلاف ایجی ٹیشن چلا۔ ایک روز میں شہر گیا تو مجھے مومن برادری کے کچھ لوگ ملے بہت برافروختہ تھے کہنے لگے" ویسے تو آپ لوگ مسلم یونیورسٹی مسلم یونیورسٹی کرتے اور اسلامی مساوات کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں لیکن ہمارا ایک ہی انصاری بھائی میڈیکل کالج میں ہے اور آپ اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ مجھے بھی اس وقت نسیم انصاری پہ بڑا ترس آیا لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا میں نے یہ واقعہ ان کے بھائی پروفیسر انور انصاری کو سنایا وہ محظوظ تو ہوئے لیکن بے بس وہ بھی تھے۔

بشیر صاحب کے بغل میں مستقیم کی درزی کی دکان ہے۔ مستقیم خاموش مزاج کے آدمی ہیں۔ میں نے ان کو بہت کم بولتے دیکھا ہے۔ بشیر صاحب سے دوستی ہے لیکن پاس ان کے کبھی نہیں بیٹھتے۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ میں نے

مورلیشیس جانے سے پہلے ان سے شیروانی سلوائی تھی۔ جب میں نے ان کی دکان میں پہنچی تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے یہ شیروانی انھوں نے ہی مجھے تحفے میں دی ہے فٹنگ دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ جیسے انھوں نے شیروانی نہ سی ہو کوئی فنی تخلیق کی ہو۔ شیروانی سینے والے درزی ہندستان میں گنے چنے رہ گئے ہیں مستقیم ان میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ خدا انھیں سلامت رکھے۔

فرینڈس بک ہاؤس کے ایک طرف جہاں مستقیم کی دکان ہے وہاں دوسری طرف حافظ جی کا اختر پرنٹنگ پریس ہے۔ حافظ جی بڑے مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ ان کے انتقال کو شاید سولہ سترہ سال ہو گئے۔ ان کے دامادوں نے ان کے بعد اس کام کو چلایا۔ اچھا خاصا چلایا لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو حافظ جی کے زمانے میں تھی۔ پھر حافظ جی کا لڑکا بڑا ہو گیا تو اس کام کو اس نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اب تو صرف پرانی مشینوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کوئی پریس ہے۔

ہند بائنڈنگ ہاؤس کے عطار احمد یہیں کام کرتے تھے۔ لڑکوں کی ...نا اور ڈاکٹریٹ کی تھیسس کی جلدیں باندھتے تھے۔ حافظ جی کے انتقال ...عد ان کے ورثا نے عطار احمد کی قدر نہ جانی۔ لیکن عطار احمد بڑے ...ن والے آدمی ہیں۔ برسوں نباہتے رہے۔ مجھے یاد ہے غالباً اٹھارہ انیس سال پہلے کی بات ہے کہ عطار احمد کے بیٹے ذکار احمد نے ہند بائنڈنگ کی بنیاد ڈالی اور اپنا کام شروع کیا تو عطار احمد کو یہ بات پسند نہ آئی کہ حافظ جی کی دکان کے مقابلے میں شمشاد میں دکان کھولی جائے کہتے تھے کہ "حافظ جی میرے استاد تھے انھوں نے مجھے کام سکھایا ہے۔ مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے۔" حالانکہ شمشاد میں بائنڈنگ کا کام اتنا ہے کہ ایک کیا بائنڈنگ کی چار دکانیں کھل سکتی ہیں۔ بہت دنوں تک باپ بیٹوں میں جھگڑا ہوتا رہا۔ لیکن بہر حال بیٹے کو بھی کچھ کام تو کرنا ہی تھا۔ اس نے لالہ کی دکان کے پاس

نالی کے اس پار ایک دکان کھول لی۔ چند روز میں دکان چل پڑی۔ حافظ جی کے داماد والوں کو شاید عطار اللہ کے ساتھ وہ سلوک یاد نہیں رہا تھا جس کے عطار اللہ عادی تھے اور ایک روز میں نے دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کی دکان میں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ حالانکہ انھوں نے ملازمت نہیں چھوڑی تھی لیکن ان کو ایسا لگ رہا تھا جیسے حافظ جی کی روح کو ان کی ذات سے تکلیف پہنچی۔ وہ اُداس رہا کرتے تھے۔

آخر عطار اللہ نے دھیرے دھیرے اپنے آپ کو تسلّی دے ڈالی اور اپنے بیٹے کی دکان پر بیٹھ گئے۔ کام تو خیر کیا کرتے ہیں۔ کبھی کبھار کسی پرانے مخطوطے یا کتاب کی جلد بنانے میں کوئی پیچیدہ مسئلہ آجاتا ہے تو اس کو حل کر دیتے ہیں۔ ان کا معاملہ بوڑھے پہلوان کا ہے جو خود کشتی تو نہیں لڑسکتا لیکن ہاں داؤں پیچ بتا دیتا ہے۔ میں نے ان سے ایسی ایسی کتابوں کی جلدیں بندھوائی ہیں کہ اگر عطار اللہ نہ ہوتے تو مجھے ان کی زندگی سے مایوس ہونا پڑتا۔ میں نے انگریز والوں اور امریکیوں کو ان کی دکان پر بیٹھے اور کام کرواتے دیکھا ہے۔ جب کوئی ٹیڑھا کام آتا ہے تو عطار اللہ اتنا خوش ہوتے ہیں جیسے قارون کا خزانہ مل گیا ہے۔ گلیکسو کے ایک انجنیر ان کے کام کے بڑے قدردان ہیں۔ ان کا تبادلہ بمبئی ہو گیا تھا لیکن کام ان ہی سے کرواتے ہیں۔ عطار اللہ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنے قدردانوں کے قدرداں ہیں۔ عام دکانداروں کی طرح وہ روپے کو اہمیت نہیں دیتے۔ ان کے یہاں کام کو اولیت حاصل ہے۔ ایسے لوگ اب اس کاروبار کی دنیا میں نہیں پائے جاتے۔ ان کو دیکھ کر گالزوردی کی کہانی "کوالٹی" یاد آتی ہے۔

عطار اللہ کا زیادہ تر وقت جبّار صاحب کی دکان میں یا انوار بک ڈپو میں گزرتا ہے۔ وہاں بھی وہ اکثر پرانے قصے سناتے نظر آتے ہیں۔ وہ میرے

بڑے محسن ہیں۔ اللہ ان کی زندگی میں برکت دے۔

ذکار اللہ بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پہ چل رہے ہیں۔ وہ دراصل ہند بک بائنڈنگ کے فیلڈ آفیسر ہیں۔ سارا دن کام کے سلسلے میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ یونیورسٹی میں لوگ ان کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کو کام کی کبھی کمی نہیں رہے گی۔ لیکن اگر کاروبار کو کاروبار کی طرح کرتے تو آج ان کی دکان بہت بڑی دکان ہوتی۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے طبیعت ہی ایسی دی ہے تو وہ بھی کیا کریں۔ ایک پبلشر کی کتابوں کی ایک ہزار جلدیں باندھیں بمشکل سے پچاس نسخے نکلے ہوں گے کہ کتاب کورس سے نکل گئی۔ پھر ان سے اپنے بل کا تقاضا بھی نہیں کیا۔ کسی نے کہا "تم اپنی مزدوری تو لے لو۔" اس بات پہ ان پہ برس پڑے کہنے لگے "میری تو محنت تھی اور سو پچاس کا کاغذ اور لیئی اور اس بچارے کی تو پونجی لگی ہوئی تھی۔ وہ اتنا بڑا نقصان برداشت کر رہا ہے تو کیا میں اتنا بھی نہیں کر سکتا۔" وہ صاحب اپنا منہ سا لے کر رہ گئے۔

ہاں جیسا کہ میں نے بہادر کے بارے میں بتایا کہ وہ ایک ہی پہلو سے آج تک بیٹھے اپنی دکان میں پان لگا رہے ہیں۔ یہی حال لڈن کا ہے۔ لڈن ذکار اللہ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ہر وقت اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ میں نے کبھی ان کے چہرے پہ تھکاوٹ کے آثار نہیں دیکھے میں جب بھی ہند بائنڈنگ کا تصور کرتا ہوں تو مجھے لڈن بیٹھے نظر آتے ہیں اور ہنس رہے ہیں، وہ اس کارخانے کے جنرل منیجر بھی ہیں، چیف میکنک بھی اور سپروائزر بھی کتنے کام ایک ساتھ کرتے ہیں اور خوش نظر آتے ہیں۔ کاموں کی بھیڑ رہتی ہے۔ اسی لیے کاموں کو ٹالتے بھی ہیں۔ آج کا کام ہمیشہ کل پر چھوڑتے ہیں لیکن اگر ان کو یقین ہو جائے کہ آپ کو فی الواقعی اس کی ضرورت ہے تو پھر سب کام چھوڑ کر راتوں رات آپ کا کام کر دیا گے آج تک طالب علموں کی

کی سیکڑوں کیا، اس سے کبھی زیادہ تقیسم باقی ہیں ان کو ڈاکٹر بنا دیا لیکن کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملا کہ اس کی تقیسم وقت پر نہیں ملی۔ مجھ پر خصوصی طور پہ مہربان ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ عطا راللہ کے نیک کاموں کا اللہ نے ان کی اولاد کی شکل میں اجر دیا ہے لیکن وہ کبھی اپنے لڑکوں کی ان کے منھ پر تعریف نہیں کرتے اور نہ یہ پسند کرتے ہیں کوئی ایسا کرے۔ شمشاد میں ان کی شخصیت منفرد ہے۔

انوار بک ڈپو کا ابھی ذکر آیا ہے۔ یہ جبّار صاحب کی کاپیوں، کتابوں اور اسٹیشنری کی دکان ہے جبّار صاحب کی کیا مختار صاحب کی دکان ہے۔ مختار صاحب کاروبار کے لیے بڑی موزوں شخصیت ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہی گاہک ان کی طرف منڈلانے لگتے ہیں۔ پہلے ان کی دکان حبیب صاحب کی دکان کے بائیں طرف تھی، اب داہنی طرف آگئی ہے۔ جب وہ دکان بدل رہے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ اب یہ کاروبار ٹھپ ہو جائے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ شمشاد مارکٹ کے خریدار طالب علم ہوں یا یونیورسٹی کے اسٹاف کے لوگ، یہ دکانوں کے در و دیوار سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ان کا رشتہ تو انسانوں سے ہے جو ان دکانوں میں بیٹھتے ہیں کیونکہ اس بازار میں بعض دکانیں تو ایسی ہیں جو در و دیوار سے قطعًا بے نیاز ہیں۔ لیکن ان دکانوں میں بیٹھنے والے اس بازار کے معزز دکاندار ہیں۔

ہاں تو یہ مختار صاحب پھر فوق کریمی والی دکان میں آگئے۔ فوق کریمی کے نام پر یاد آیا کہ علی گڑھ میں شاید ہی کوئی صاحب ذوق ہو جو فوق کریمی سے واقف نہ ہو۔ یہ ایک زمانے میں۔ ربع صدی پہلے کی بات ہے ایک عالمی اردو کانفرنس کر رہے تھے جس میں قاضی عبد الغفار، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور نہ جانے کن کن لوگوں کے نام آگئے تھے۔ قومی آواز کے حیات اللہ انصاری نے کئی اداریے بھی اس کانفرنس پر لکھے اور کچھ آپ بیتی آپ...

فوق کریمی نے اس کانفرنس کو ملتوی کرتے کرتے ایک روز اس خیال کو ترک کر دیا اور پھر اچانک ایک روز اس بازار میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے شمشاد میں اردو کتابوں کی دکان کھولی۔ کتابوں کی فروخت تو کیا ہوتی، ادیبوں اور شاعروں کی محفلیں جمنے لگیں۔ جب دکان میں جاتیے تو شعر سنائی دیتے اور جب شعر نہ ہوتے تو چائے ہوتی۔ فوق کریمی کب تک یہ عیاشی کرتے آخر انھوں نے ایک اخبار "ترجمان" نکالا۔ یہ شمشاد کی زندگی میں پہلا اور خدا نہ کرے کہ آخری اخبار تھا جو نکلا۔ پھر یہ سننے میں آیا کہ وہ "ترجمان" کو سینے سے لگا کر اس بازار سے رخصت ہو گئے اور اس بازار کی ادبی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ جسے بہت دنوں کے بعد مکتبہ جامعہ کے بزمی صاحب نے پورا کیا۔

ہاں تو اب اس دکان کے وارث ہیں الوار بک ڈپو یا مختار صاحب یا جبّار صاحب — مختار صاحب کو یونیورسٹی کے لڑکے الوار صاحب کہتے ہیں۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ الوار نام ہے جبّار صاحب کی لڑکی کا اور اس لڑکی کے نام پر جبّار صاحب نے الوار بک ڈپو رکھا۔ اور لڑکے اس چکر میں نہیں پڑتے کہ مختار صاحب کون ہیں اور دکان کا نام کیوں اور کیسے پڑا۔ وہ انھیں الوار صاحب کہتے ہیں اور چونکہ مختار صاحب کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے اس لیے دونوں نام اپنی اپنی جگہ پر ہیں۔

مختار صاحب اور حبیب صاحب کی دکانیں اغل بغل ہیں۔ اس لیے ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ آتا ہے۔ کیونکہ شمشاد میں اگر دو افراد میں رقابت ہے تو ان ہی دونوں میں ہے۔ حبیب صاحب بدایوں کے رہنے والے ہیں۔ دراصل حبیب صاحب کی صحیح شخصیت کو سمجھنے کے لیے کافی عمر اور تجربے کی ضرورت ہے۔ وہ اس بازار میں اٹل بہاری باجپائی ہیں۔ گرجتے گو نجتے ہیں لیکن ان کے دانتوں میں اتنی طاقت بھی نہیں کہ کسی کو کاٹیں تو اس کی کھال

ہی چھل جائے۔ حبیب صاحب کی آواز میں بڑا کراراپن ہے۔ وہ جب بولتے ہیں تو سارا شمشاد گونج اٹھتا ہے۔ وہ دو ایک روز کے لیے بھی کہیں چلے جاتے ہیں تو بازار میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ ایک ہو کا عالم ہوتا ہے جیسے ایک مجمع چھٹ گیا۔ لاؤڈ اسپیکر کا شور بھی اس کمی کو پورا نہیں کر سکتا۔ ویسے وہ شمشاد کا ایک ایسا لازمی حصہ ہیں کہ کبھی کہیں جاتے نہیں اور جاتے بھی ہیں تو جب تک مجبور نہیں کر دیے جاتے۔ ویسے بڑے تجربہ کار اور جہاں دیدہ ہیں اور اور پولیس والوں سے بڑی دوستی رکھتے ہیں۔ لیکن پولیس والوں کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ اپنے باپ کے نہیں ہوتے تو حبیب صاحب کے کیا ہوں گے۔ چنانچہ حبیب صاحب کو اکثر یہ تعلقات بہت مہنگے پڑے۔ لیکن ان کے ماتھے پر کبھی ایک شکن بھی نہیں پڑتی۔ میں نے اس شمشاد میں حبیب صاحب کے بے شمار معرکے دیکھے ہیں لیکن حبیب صاحب کا سر جھکتے نہیں دیکھا۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو ٹوٹ جائیں گے لیکن ان میں خم پیدا نہ ہوگا اور معرکے حبیب صاحب کی زندگی کا جزو ہیں۔ وہ ان سے اپنے کو علاحدہ نہیں کر سکتے۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب ان کا چھوٹا لڑکا ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ وہ ایم۔اے میں پڑھتا تھا اور بڑا ہونہار تھا لیکن موت نہ نوجوانی دیکھتی ہے اور نہ ہونہار ہونا دیکھتی ہے۔ رائڈنگ کلب کے ایک فنکشن میں گھوڑے سے گر پڑا اور گھوڑے کے پیر کے نیچے آگیا۔ اس کا صدمہ ہر ایک کو تھا پورا شمشاد سوگ میں ڈوبا ہوا تھا میں نے جیسے ہی سنا دوڑا ہوا گیا سوچ رہا تھا کہ حبیب صاحب پر نہ جانے کیا بیت رہی ہوگی غم کا ایک پہاڑ تھا جو اک بارگی ان پر ٹوٹ پڑا۔

میں جب پہنچا تو وہاں نہ صرف شمشاد کے لوگ تھے بلکہ یونیورسٹی کے اساتذہ بھی۔ حبیب صاحب کے چہرے پہ غم کا ایک گہرا سایہ تو تھا ہی لیکن یونیورسٹی کی ممتاز ہستیوں کو اپنے گھر میں دیکھ کر ان کے چہرے پر

ایک خاص بات اور تھی جس کے اظہار کے لیے میں الفاظ تلاش کر رہا ہوں لیکن ملتے نہیں۔ بہرحال حبیب صاحب ایک اک سے اپنے لڑکے کی خوبیاں بیان کر رہے تھے پھر جب جنازہ اٹھا تو اس جنازے کے ساتھ ایک زبردست مجمع تھا۔ شمشاد کی ہر دکان بند تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے سارا شہر ماتم میں ڈوبا ہوا ہو۔

حبیب صاحب جنازے کے ساتھ تھے لیکن اس بھیڑ میں وہ ہر طرف نظر آ رہے تھے وہ فوٹو گرافر کو ساتھ لیے ہوئے تھے۔ انھیں جزئیات کا خاص طور پر خیال تھا کہ مجمع کی ہر پہلو سے تصویر آجائے اور اس اہتمام کا انھوں نے اس وقت تک خیال رکھا جب تک کہ لاش قبر میں نہیں اتاری گئی۔

پھر جب تصویر بن کر آئیں تو حبیب صاحب ہر ایک کو تصویر دکھاتے تھے کہ دیکھیے ایسا جنازہ بھی کسی کا اٹھا ہوگا۔ اور سچ ہے کہ طارق کی موت ایک بڑی المناک موت تھی خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

حبیب صاحب کو کبھی اس کی فکر نہیں کہ لوگ ان کا ساتھ دیتے ہیں یا نہیں۔ وہ عام طور پر کسی نہ کسی جھگڑے میں ضرور ملوث رہتے ہیں اور جیت بھی ان کی نہیں ہوتی۔ کیوں کہ مارکیٹ والے عام طور پر ان کا ساتھ نہیں دیتے۔ ان کے معاملے میں مذہب و ملت کی بھی کوئی قید نہیں لالہ کے لڑکوں سے جھگڑا ہو یا مختار صاحب سے، میں نے پبلک کو ان کا ساتھ دیتے نہیں دیکھا لیکن ان کو اس کی پروا بھی نہیں، اور نہ جھگڑے کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکیلے ہیں۔

ان کا معاملہ تو بقول میر مینائی

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے امیر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

وہ مختار صاحب سے برد آزما رہے ہیں اور اشرف درزی سے

بھی۔اشرف درزی شمشاد کا سب سے کمزور فرد ہے ہر اعتبار سے۔ برسوں گزر گئے اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ پہلے کسی ٹیلر ماسٹر کی دکان میں کام کرتا تھا اس وقت بھی اس کی وہی حالت تھی جو آج ہے۔جب کہ وہ مکتبہ جامعہ کی دکان کے بغل میں نیشنل ٹیلرز کے نام سے کام کر رہا ہے۔مجھ کو اپنا ازلی ہمدرد سمجھتا ہے اور نہ جانے کیوں مجھے اندرا گاندھی سمجھتا ہے کہ جب کسی پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے۔ میرے پاس آتا ہے۔لفظ اگر مرہم کا کام کر سکتے ہیں تو میں نے بھی اکثر اس کے زخموں پر مرہم رکھا ہے بیچارہ سیدھا سادا شریف آدمی ہے لیکن تقدیر بہت سے بدنصیبوں کی اکھٹا لے کر آگیا ہے۔مجھے اس پر اتنا ترس آتا ہے کہ میں عام طور پر اپنے سوٹ شیروانی اسی سے سلواتا ہوں۔لوگ کہتے ہیں کہ بڑے پرانے فیشن کے کپڑے پہنتا ہوں، لیکن مجھے بہت اچھے لگتے ہیں کیونکہ یہ اشرف کے سلے ہوئے ہیں اور اشرف ضرورت مند ہے۔

غالبًا یہ جذبہ مجھے ورثے میں ملا ہے۔پینتیس چالیس سال پہلے کی بات ہے میں الہ آباد میں رہتا تھا۔ہمارے خاندانی درزی تھے انھیں غنی میاں کہتے تھے۔میں اور میرے دونوں بھائی کتنا ہی احتجاج کریں، لیکن ہمیں کپڑے ان ہی سے سلوانے پڑتے۔ایک سے ایک قیمتی کپڑا آتا لیکن غنی میاں اسے اپنے مخصوص انداز سے سیتے تھے۔ وہ بڑے دور اندیش تھے۔یہ کہتے کہ بچوں کا جسم بڑھتا ہوا ہوتا ہے اس لیے بچوں کے کپڑے ڈھیلے ڈھالے ہی ہوں تو اچھا رہتا ہے۔چنانچہ ہم شیروانی کے نام پر چوغا اور قمیص کے نام سے کرتے سے زیادہ لمبی چوڑی کوئی چیز پہنتے تھے غنی میاں جب چھوٹا کوٹ سیتے تو اوور کوٹ کا شبہ ہوتا۔چنانچہ جب بھی ہم چچا صاحب سے احتجاج کرتے تو وہ یہی کہتے "تم نہیں سمجھتے، وہ بہت غریب ہیں اور ابا کے زمانے سے ہمارا کام کر رہے ہیں۔لہذا کپڑوں کے سینے کے لحاظ سے درزی کا انتخاب نہیں

کیا گیا تھا بلکہ غریبی کے اعتبار سے درزی کا انتخاب ہوتا تھا۔

ہاں تو اشرف کی پہلی دکان حبیب صاحب کی دکان کے پیچھے نواب صاحب کے گھر سے ملی ہوئی تھی۔ ایک روز حبیب صاحب نے اسے بے دخل کرنا چاہا، بڑا زبردست معرکہ ہوا جس میں بازار کے تمام ذمہ دار حضرات بشمول اسد یار خاں شریک تھے۔ بالآخر بہت دنوں کے بعد وہ قصہ ختم ہوا۔ اشرف نے باعزت طور پر وہ دکان چھوڑ دی اور اب بازار میں آ گئے۔

لیکن حبیب صاحب اور مختار صاحب کے تعلقات اور اختلافات اپنی جگہ پر ہیں۔ اول تو وہ دونوں ایک دوسرے کے زیر سایہ ہیں اور پھر دونوں سال میں چھ مہینے عید کارڈ قسم کے کارڈ دکانوں کے سامنے تختہ بچھا کر شامیانے لگا کر ایک دوسرے کے مقابلے میں بیچتے ہیں، کاروبار دونوں کا خوب چلتا ہے لیکن ایک سرد جنگ ہے جو خاموشی سے جاری رہتی ہے۔ دل کے دونوں اچھے ہیں اور اس لیے کوئی ناخوشگوار شکل نہیں پیدا ہوتی۔

اس اختلاف کا شمشنا دیہ یہ اثر ضرور رہا کہ ایک سایہ دار پیڑ کٹ گیا جو ان دونوں کی دکانوں کے سامنے تھا۔ میں اس کا ذکر کر کے اس دبے ہوئے جھگڑے کو چھپکلی کی طرح اٹھا کر دوبارہ زندہ نہیں کرنا چاہتا۔ اس پیڑ کے کٹنے کا کسی اور پر پڑے نہ پڑے لیکن اب ان دونوں دکانوں میں سامان کے ساتھ دھوپ بھی بھری رہتی ہے۔ سامان کو تو خیر اِدھر اُدھر رکھا بھی جا سکتا ہے لیکن ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دھوپ کو کہاں سمیٹا جائے۔ بہرحال اب مختار صاحب اور حبیب صاحب کی طرح شام کے وقت دھوپ بھی حقیقت بن گئی ہے۔ اور انھوں نے اسے انگیز کرنا بھی سیکھ لیا ہے۔

حبیب صاحب کے بارے میں شمشاد کے جہاندیدہ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ دل کے بُرے نہیں ہیں میں کہتا ہوں زبان کے بھی بُرے نہیں ہیں ـــ اب وہ حلق کے سلسلے میں کیا کریں، مجبور ہیں، بولیں گے تو آواز تو نکلے ہی گی۔ شمشاد میں وہ ایک زندہ حقیقت ہیں۔ شمشاد والوں نے ان کی آواز کے ساتھ جینا سیکھ لیا ہے۔ کسی کو ان سے شکایت نہیں کہ وہ اتنے زور سے کیوں بولتے ہیں ـــ اور کبھی کبھی تو میں نے دیکھا ہے کہ وہ انسانوں ہی سے نہیں اپنے بکرے سے بھی اسی انداز میں بولتے ہیں۔ لیکن بکرے کو ان سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ ہر سال ایک بکرا پالتے اور اس کی قربانی کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس محبت سے وہ یہ بکرا پالتے ہیں بالکل اولاد کی طرح ـــ جب وہ اس کی قربانی کرتے ہیں تو مجھے وہ پہلی قربانی یاد آجاتی ہے جس کا خیال ایک نبی ـــ ایک انسان کو آیا تھا۔ حبیب صاحب ہر سال ایک ایسی قربانی کرتے ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ محبت، محنت اور ریاضت سے پالے ہوئے جانور کی قربانی کرنا کتنی بڑی بات ہے۔

شمشاد نے حبیب صاحب کی جوانی دیکھی ہے اور ان کا بڑھاپا بھی دیکھ رہا ہے۔ یہ سرزمین نہ جانے کیا کیا دیکھے ہوئے ہے۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے کہ شمشاد کی رونق ان کے دم سے ہے۔

اسماعیلیہ بلڈنگ کے سامنے خاص طور پر بشیر صاحب کی دکان چیمپئن ڈیری اور حبیب صاحب کے سامنے ٹھیلے والے صبح سے رات تک پھل بیچتے ہیں ـــ ان دکانداروں کو کوئی اعتراض بھی نہیں ـــ اول تو یہ پھل والے پیڑ کے نیچے تو ہیں ہی، لیکن کبھی کبھی وہ دکانوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ کچھ نہیں کہتے کیوں کہ شمشاد کے دکانداروں کا خیال ہے کہ وہ اپنے کاروبار کا نہیں کھاتے،

تقدیر کا کھاتے ہیں ۔ اگر کبھی میونسپلٹی والے آجاتے ہیں تو یہ دکاندار ہی ان ٹھیلے
والوں کی مدد کرتے ہیں ۔ ذرا سی دیر میں میدان صاف ہو جاتا ہے جیسے یہاں کبھی
کچھ تھا ہی نہیں اور میونسپلٹی والوں کے جاتے ہی پھر یہ لوگ اپنی جگہ پر آ جاتے
ہیں اور آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں ۔" سنترہ دو روپے درجن دو روپے
۔۔ دو رو ۔ " یہ لوگ اپنا سودا آوازیں لگا لگا کر بیچتے ہیں اور خریدار
کو اتنی محبت، سے پھل دیتے ہیں کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ خصوصیت صرف میرے
لیے ہے ۔ یہاں دو بجے کے بعد یونیورسٹی کے اساتذہ نظر آتے ہیں کبھی کبھی
زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی اور ثریا حسین کی کاریں یہاں نظر آتی ہیں ۔ البتہ
مقطع لوگ جو اپنی شیروانی میں بٹن لگاتے، ہیں وہ حبیب صاحب کی بازو والی
دکان ہی سے پابندی سے پھل خریدتے ہیں جیسے ڈاکٹر مسعود عالم ۔ چاہے وہ
امین اشرف کے ساتھ ہوں یا اکیلے، ہمیشہ اسی دکان سے خریدتے ہیں ۔ ان
کے خریدنے کا طریقہ بھی نرالا ہے پہلے پچھلے روز جو پھل لے گئے تھے اس کی
شکایت کریں گے پھر اپنا روز کا راشن لیں گے ۔ پھل والا بھی مزاج داں ہے
وہ کہتا ہے کہ آج بہت تازے پھل ہیں ۔ یہ میں نے خاص طور پر آپ کے
لیے رکھے ہیں ۔ یہ کہہ کر وہ خاص طور پر اندر سے نکال کر لاتا ہے ۔ دراصل
باہر تو بہت کم پھل رہتے ہیں ۔ زیادہ تر اسٹاک تو اندر ہی رہتا ہے ۔ اور
باہر والے پھل تو محض ہاتھی کے دانت ہیں ۔

ہاں مگر اسماعیلیہ بلڈنگ کے سامنے بیٹھنے والے ٹھیلے والوں کا ظاہر
و باطن یکساں ہے آپ اپنی پسند سے یہاں پھل چھانٹ لیجیے ۔ ان کو کوئی
اعتراض نہیں ۔ صبح سے شام تک لوگ یہاں پھل چھانٹتے نظر آتے ہیں اور
رات کو جب وہ اپنا ٹھیلہ بڑھاتے ہیں تو ایک ایک پھل بک چکا ہوتا ہے
ان کے اسٹاک میں اگلے دن کے لیے کچھ نہیں بچتا ۔

میں نے کہا کہ یہاں آپ کو یونیورسٹی کے اساتذہ نظر آئیں گے ۔ شام

کو وحید قریشی اپنی چھڑی ہلاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ملک نسیم قریشی، اور کبھی کبھی کچھ خواتین بھی۔

ڈاکٹر معین احسن جذبی تو خیر شمشاد میں شام کے وقت عام طور پر نظر آتے ہیں۔ وہ صرف جبار صاحب کے یہاں یا ذوق والا تمباکو خریدتے ہیں۔ باقی وہ یہاں محض گھومنے آتے ہیں۔ ان کا یہ عمل برسوں سے جاری ہے۔ وہ چاہتے تو اب سے آٹھ دس سال پہلے شمشاد میں اپنے مسلسل آتے رہنے کی جبلی منا لیتے۔ بعض اعتبار سے جذبی صاحب بڑے وضعدار ہیں۔ شمشاد میں ایک بڑھیا فقیرنی ہے جو پہلے جوان تھی اور اب بہیں بوڑھی ہو چکی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شام ہوئی اور وہ جذبی صاحب کا انتظار کرنے لگی۔ کیونکہ جذبی صاحب جہاں میکڈانلڈ کی پلیا پر آئے اور یہ فقیرنی ان کے پیچھے ہو لی۔ جذبی صاحب کا کہنا ہے کہ پچیس تیس سال ہو گئے اس کے مانگنے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ حالانکہ انھوں نے کبھی اسے ایک پائی نہیں دی مگر وہ مایوس نہیں ہوئی اور وہ بلا ناغہ جذبی صاحب کی جھڑکیاں کھاتی ہے لیکن اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم ہے۔ جذبی صاحب اس سے بیزار رہتے ہیں لیکن اتنی سی بات پر شمشاد آنا کیسے چھوڑ دیں۔

ایک زمانے میں یہاں ڈاکٹر ہادی حسن بڑی پابندی سے پھل خریدنے آتے تھے۔ ڈاکٹر ہادی حسن یونیورسٹی کے دیوانے بھی تھے اور فرزانے بھی۔ انھوں نے یونیورسٹی کے میڈیکل کالج کے لیے اتنا کچھ کیا کہ لوگ اپنی اولاد کے لیے بھی نہیں کرتے۔ ہادی صاحب کی یادداشت غضب کی تھی۔ نہ جانے کتنی کتابیں انھیں زبانی یاد تھیں۔ براؤن کی "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" انھیں زبانی یاد تھی۔ کہا کرتے تھے کہ برسوں ہو گئے ہیں اپنی زبان نہیں بولا۔ بڑے اعلیٰ درجے کے مقرر تھے۔ تقریر کیا کرتے تھے، منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ حیدرآباد کے تھے لیکن ان کے رخسار پہ ایرانی حسن کی جھلک نظر آتی تھی۔

گورے چٹے کھلے قد کے۔

جب میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو ان کے بارے میں طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ شعبہ ریاضی، شعبہ نباتات، شعبہ انگریزی اور نہ جانے کن کن شعبوں کے صدر رہ چکے تھے لیکن جب میں سن ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ آیا تو وہ شعبہ فارسی کے صدر تھے۔ پروفیسر فیلڈن سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ پروفیسر ال۔ کے۔ حیدر کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ ال۔ کے حیدر، شعبہ معاشیات کے سربراہ تھے۔ ہندستانی تھے لیکن انگریزوں کی طرح انگریزی بولتے تھے چپراسی کو آواز دیتے تو یہی کہتے "یہاں آنا مانگتا ہے" وہ جاڑے میں ڈیپارٹمنٹ کے سامنے کرسی بچھا کر بیٹھتے۔ دو کرسیاں آمنے سامنے ہوتیں۔ ایک پر بیٹھتے اور دوسری پر پاؤں رکھتے۔ بڑے سے بڑا آدمی آجائے وہ اپنے پاؤں کرسی پر سے نہیں ہٹاتے تھے۔ چپراسی کو آواز دے کر دوسری کرسی منگواتے تھے۔ معاشیات کے بڑے عالم تھے، لیکن یونیورسٹی کے لڑکے ان سے اس لیے مرعوب تھے کہ مشہور تھا کہ وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو کے ہم زلف تھے۔ بڑے سے بڑے آدمی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ڈاکٹر سرضیاء الدین احمد کے مقابلے میں ہمیشہ شمشیر بکف رہتے تھے۔ ذاکر صاحب کے استاد تھے۔ ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور یہ محبت کچھ اس لیے بھی تھی کہ ذاکر صاحب اور سرضیاء الدین احمد ایک دوسرے کے مخالف گروہ میں تھے شاید انگریز بیوی کی رعایت پیش نظر ہو کر وہ مزاجاً انگریز تھے۔ ایک روز انھوں نے ذاکر صاحب کو کھانے پر بلایا۔ ذاکر صاحب حسب دستور رشید صاحب کے یہاں مقیم تھے۔ ہم چند طالب علم ان کے پاس بیٹھے تھے۔ پھر ان کے ساتھ ساتھ پروفیسر ال۔ کے۔ حیدر کی کوٹھی تک چھوڑ آئے۔ ذاکر صاحب کو ۴۵ منٹ کی دیر ہوگئی۔ ال۔ کے حیدر اس کوٹھی میں رہتے تھے جواب

یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے لیے مخصوص ہے۔ اگلے دن ذاکر صاحب نے بتایا کہ جب وہ وہاں پہنچے تو کھانے کا کوئی ذکر نہ تھا۔ ذاکر صاحب سمجھے کہ شاید ڈاکٹر صاحب بھول گئے ہیں۔ ذاکر صاحب نے ان کو یاد دلایا کہ "آپ نے کھانے پر بلایا تھا"۔ ڈاکٹر حیدر صاحب نے حیرت سے کہا "ول ذاکر! تم نے ڈنر نہیں لیا۔ ہم نے ایٹ تھرٹی پر تمھارا ویٹ کیا۔ پھر اپنا ڈنر لے لیا۔" پھر وہ ملازم سے بولے۔ "ول تم جانتا ہے۔ یہ صاحب ڈنر پر آنے کو ہوتا۔ اب لیٹ آیا۔ تم دیکھو اگر ڈنر بچا کھچا ہو تو ڈائننگ میں نہیں، یہیں لا دو۔"

ذاکر صاحب کا کہنا تھا کہ جب ڈائننگ روم میں کھانا لاکر رکھا گیا تو اتنا تھا کہ تین آدمی اطمینان سے کھا سکتے تھے۔

آزادی کے بعد ال، کے، حیدر انگلستان چلے گئے۔ ڈاکٹر سلامت اللہ (جامعہ) سے ان کی ملاقات لندن میں عید کی نماز کے بعد ہوئی تھی۔ سلامت صاحب کہہ رہے تھے کہ مجھے سیاہ شیروانی میں دیکھ کر لپٹ گئے اور زار و قطار رونے لگے۔ سچ ہے ملمع بالآخر چھوٹ ہی جاتا ہے۔ وہ دھات پر ہو یا انسانوں پر، ملمع پھر ملمع ہے۔

ال، کے، حیدر شام کو کبھی کبھی نقوی پارک کے سامنے ڈگی روڈ سے ملحقہ فیلڈ میں "گولف" کھیلتے تھے جہاں اب "ملکھان کالونی" ہے۔ اس وقت ان کے ساتھ پروفیسر فیلڈن ہوتے تھے۔ فیلڈن ہر لحاظ سے انگریز تھے۔ وہ ہندستانیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کا یہ جملہ یونیورسٹی میں بہت عام تھا "مائی ڈگس کین بارک بیٹر انگلش دین انڈینس۔"

فیلڈن تقریباً پچیس تیس سال ہندستان میں رہے ہے۔ ہندستانیوں کا چوبیس گھنٹے کا ساتھ تھا لیکن وہ ہندستانی کا ایک جملہ بھی نہیں بول

سکتے تھے۔ انگریزی زبان کے بہت اچھے استاد تھے کہ ہندستان کی کم ہی یونیورسٹیوں میں ایسے استاد ہوں گے۔ ان سے کتنے ہندستانیوں نے انگریزی سیکھی۔

دوستی میں بہت محتاط تھے اس لیے نمائش روڈ پر دی ہینز" میں سب سے الگ تھلگ رہتے تھے۔

ہاں تو یہ بھی ڈاکٹر ہادی حسن کے دوست تھے۔ ڈاکٹر ہادی حسن لڑکوں کی نفسیات سے خوب واقف تھے اسی لیے طالب علموں میں بے حد مقبول تھے اور جانتے تھے کہ عام طالب علموں کو کس طرح مٹھی میں لینا چاہیے۔ ان کی اس صلاحیت سے ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد پورا پورا فائدہ اٹھاتے تھے اور ہادی صاحب کو اپنا داہنا ہاتھ سمجھتے تھے۔

ایک روز ہمارا فائنل کا کلاس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر ہادی حسنؒ عمر خیام" پڑھا رہے تھے۔ لطف آ رہا تھا۔ لفظوں کی دھیمی دھیمی بارش ہو رہی تھی۔ ساری جماعت خیام کے عہد میں پہنچ چکی تھی کہ اچانک ہاکی کے مشہور کھلاڑی شکور ادھر آ ئے۔ شکور اس وقت یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور انڈیا الیون میں کھیل چکے تھے اور باہر بھی جا چکے تھے۔ ایسے ہاکی کے کھلاڑی علی گڑھ میں کم آئے۔ انعام الرحمٰن اور علی سعید نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ دوسرے ملکوں میں اولمپک کی میچوں میں شریک ہوئے۔ انعام الرحمٰن غیر معمولی صلاحیت کے کھلاڑی تھے لیکن ہم استاد ان کو یہ بھی نہ سکھا سکے کہ انسان کو اپنے مزاج پر قابو رکھنا چاہیے۔

ہاں تو میں شکور کی بات کر رہا تھا۔ وہ شعبہ فارسی کے برامدے میں آکر کھڑے ہو گئے ہادی صاحب نے ان کو بلوایا تھا کیوں کہ ان کا اور کپتان صاحب کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ اور جب سالانہ گروپ فوٹو

ہوا تو اس میں شکور کو پیچھے، چپراسی کے پاس کھڑا کر دیا۔ شکور نے سیدھے جا کر وائس چانسلر سے شکایت کر دی۔ ڈاکٹر ضیاءالدین احمد نے کپتان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے حکم دے دیا۔ معاملہ ہادی صاحب کے پاس آیا۔ وہ اس ہال کے پرووسٹ تھے۔ انھوں نے شکور کو طلب کیا۔ شکور باہر ٹہل رہے تھے اور اندر کمرے میں ڈاکٹر ہادی حسن "عمر خیام" پر زوردار لکچر دے رہے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی نظر شکور پر پڑی تو وہ تیزی سے نکلے اور شکور کو لاکر اپنی کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ کہتا رہ گیا مگر ہادی صاحب بھلا کہاں ماننے والے تھے کہنے لگے " کلاس ختم ہوجائے تو میں تم سے بات کروں گا۔"

اب غور کیجیے پروفیسر کی کرسی پر ایک طالب علم بیٹھا ہے اور سامنے پوری کلاس کبھی اس کو اور کبھی پروفیسر کو دیکھ رہی ہے شکور کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔ اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہادی صاحب برابر لکچر دیے جارہے تھے۔ ایک مرتبہ ہادی صاحب برامدے میں گئے۔ اسمٰعیل کو آواز دی۔ اسمٰعیل شعبہ فارسی کا پستہ قد چپراسی تھا۔

ہادی صاحب نے چپراسی سے کہا "جاؤ شمشاد سے مرزا صاحب کو بلا لاؤ۔" مرزا صاحب فوٹوگرافر تھے۔ ہم سب حیران تھے کہ اس وقت فوٹوگرافر کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن پھر ذرا دیر کے بعد انھوں نے خود اس عقدے کو حل کر دیا۔ شکور سے بولے " ابھی مرزا صاحب آرہے ہیں، مجھے آپ کے ساتھ ایک تصویر کھنچوانی ہے۔ اس تصویر میں میں زمین پر بیٹھوں گا اور آپ کرسی پر بیٹھیں گے۔ اور پھر میں اس تصویر کی ایک ایک کاپی ساری یونیورسٹی میں ہر لڑکے کو بھیجوں گا۔"

شکور کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پروفیسر کی کرسی پر بیٹھے بیٹھے ان کے اعصاب پہلے ہی جواب دے چکے تھے۔ اور اب تھر تھر کانپ رہے

تھے۔ شکور نے کہا: "ڈاکٹر صاحب! آپ ہمارے استاد ہیں آپ زمین پر کیوں بیٹھیں۔ مجھ سے ایسا کون سا قصور ہوا؟"

ڈاکٹر ہادی حسن نے کہا "تم کو یہی شکایت ہے کہ کپتان نے تم کو پیچھے کھڑا کر دیا اور اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ میں زمین پر بیٹھوں اور تم کرسی پر بیٹھو۔"

شکور بے حد شرمندہ تھے۔ ہادی صاحب نے کہا: "جانِ من! صدرِ ہر جا کہ نشیند صدر است،" تصویر میں تم پیچھے کھڑے ہو۔ چپراسی کے پاس لیکن جب بھی کوئی یہ تصویر دیکھے گا تو وہ حیرت سے کہے گا، کمال ہے اولمپک کھلاڑی شکور تو پیچھے کھڑے ہیں اور معمولی کھلاڑی کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔

یہ بات شکور کی سمجھ میں آگئی اور ذرا سی دیر میں ڈاکٹر ہادی حسن نے اس سے وہ شکایت واپس لے لی۔ اور یہ قصہ خوش اسلوبی سے ختم ہو گیا۔

ڈاکٹر ہادی حسن ایسے معاملات میں ماہر تھے، وہ جانتے تھے کہ لڑکوں کو کیسے قابو میں کیا جاسکتا ہے۔ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ لڑائی کی وجہ سے ناشتے میں مکھن کی گولی آدھی کر دی گئی تھی۔ ایس۔ ایم۔ ہال کے لڑکوں نے اسٹرائک کر دی۔ یہ اسٹرائک سات دن تک چلتی رہی۔ لڑکوں نے ناشتہ نہیں لیا۔ پھر ایک وفد ہادی صاحب سے ملنے کے لیے تیار کیا گیا۔ ہادی صاحب طلبہ کے اس وفد کے استقبال کے لیے باہر کھڑے تھے: "بیائید بفرمائید جانِ من" کہتے ہوئے اندر لے گئے۔ پھر ڈائننگ روم میں پانچوں لڑکوں کو لے گئے۔ وہاں باقاعدہ ناشتہ چنا ہوا تھا۔

ڈاکٹر ہادی حسن ہیڈ کلینر کی طرح کھڑے ہوئے تھے انھوں نے میز پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور نوکر کو آواز دی: "یہاں میز پر پھر مکھن لگایا۔ تم کو معلوم ہے کہ میں مکھن نہیں کھا رہا ہوں۔ میرے لڑکے مکھن نہیں کھا رہے ہیں۔

اور تم نے میز پر مکھن لگا دیا۔" یہ کہہ کر جو انھوں نے وہ چینی کی پلیٹیں پھینکی ہیں تو چھنا چھن آواز آئی۔ چینی کی پلیٹ کے ٹوٹنے کی آواز دلوں کو دہلانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ طالب علموں پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ میرے ذہن میں ہادی صاحب کی ڈانٹ اور پلیٹوں کی چھنا چھن ٹوٹنے کی آواز آج تک محفوظ ہے۔

ہادی صاحب نے پھر معذرت طلب کی اور بڑی خندہ پیشانی سے سب کو ناشتہ کرایا اور رخصت کیا۔ وہاں فضا کچھ ایسی تھی کہ اصل موضوع پر بات کرنے کی کوئی گنجائش نہ نکل سکی۔ سب ہال واپس آ گئے۔ اور پھر ہادی صاحب کے خیال سے اسٹرائک واپس لے لی گئی۔

ہادی صاحب جادو بیان مقرر تھے۔ اگر آج علی گڑھ میں میڈیکل کالج ہے تو اس میں ان کی جادو بیانی کا بڑا دخل ہے۔ وہ بڑے باصلاحیت استاد تھے لیکن ان کی جادو بیانی ان کی معلمی کے لیے شاید مضر ہی ثابت ہوئی وہ یونیورسٹی کے انتظامی معاملات میں الجھے رہتے تھے۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کے دست راست تھے اسی لیے وہ سر ضیاء الدین احمد کے اشاروں پر چلتے تھے۔ یہ المیہ صرف تنہا ڈاکٹر ہادی حسن کا نہیں تھا بلکہ ڈاکٹر صاحب کے زمانے سے لے کر آج تک یہی صورت ہے کہ اکثر و بیشتر اچھے استادوں کا وقت وائس چانسلر کے دائیں بائیں گزرتا ہے اور وائس چانسلر بھی یہ نہیں سوچتا کہ یہ خوش نصیب پروفیسر کس وقت پڑھاتا ہوگا۔ جس وقت یونیورسٹی کے استاد کا علم اور تجربہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ یہ طالب علم اس سے استفادہ کر سکیں۔ اس وقت وہ پروفیسر ایسے کاموں میں الجھا ہوتا ہے جس کا اس کی ذہنی صلاحیت سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا اور ایسی ہی چند باتیں جب میرے ذہن میں آتی ہیں تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ ضرور سر سید نے اس کی بنیاد میں کوئی اینٹ ٹیڑھی رکھ دی ہے۔ ذکر ہادی صاحب کا تھا اور یہ

سخن گسترانہ بات آپڑی۔ ورنہ میں بادشاہ استادوں کے بارے میں بات کہنے کی کیا مجال رکھتا ہوں۔

۴۷ء کے بعد علی گڑھ میں ہادی صاحب زیادہ نمایاں کردار ادا نہ کرسکے وقت بھی بدل گیا تھا اور حالت بھی۔ لیکن ڈاکٹر ہادی حسن وہی تھے۔ آخری دم تک وہی رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی یہیں رہے اور کبھی کبھی شمشاد مارکٹ میں نظر آئے تو ایسا لگتا کہ بجلی کوند گئی! ان کی شخصیت غیر معمولی تھی۔ گورا چٹا بدن، کالی ڈور کا چشمہ جو صرف ضرورت پڑنے پر لگایا جاتا تھا۔ شیروانی پہنتے تھے اور علی گڑھ میں وہی اکیلے تھے جو چوڑی دار پاجامے پر چپل پہن کر نکلتے۔ پیروں کا گورا گورا رنگ بھلا لگتا۔ انھوں نے علی گڑھ کی اس ٹھوٹی سی روایت کو توڑ کر اس میں حسن پیدا کر دیا۔ ان سے پہلے اور نہ ان کے بعد کسی نے پھر شیروانی، چوڑی دار پاجامہ اور چپل ایک ساتھ پہنے۔ پروفیسر عشرت حسین الوزجواب شعبۂ فلسفہ کے سربراہ ہیں، وہ بہت دنوں تک ہادی صاحب کی نقل کرتے رہے مگر وہ بات پیدا نہ ہوئی۔ البتہ عشرت صاحب کی شخصیت میں ان کی اپنی انفرادیت پیدا ہوگئی ہے۔

بات سے بات نکلتی ہے اور کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ حبیب صاحب کا ذکر تھا اور بات پہنچی ہادی صاحب تک۔ آئیے اب پھر حبیب اینڈ سنز کے پاس شمشاد میں آجائیے۔ حبیب صاحب کے ایک دوست ہیں نواب صاحب۔ نواب قاسم علی کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ ان کو دو چیزوں کا شوق ہے۔ شادیاں کرنے کا اور کاروبار کرنے کا۔ نوابی کی شان کو وہ ان دونوں میں قائم رکھتے ہیں۔ شاعر بھی ہیں اور مرثیہ گو بھی۔ یہ لفظ میں سوچ سمجھ کر استعمال کر رہا ہوں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں مرثیہ گو کو شاعر نہیں مانتا نواب صاحب کی گفتگو سننے کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر وہ نثر بھی لکھیں تو یقیناً اس میں نئی بات پیدا کریں گے۔ یہ بات کرتے ہیں تو گویا پھول جھڑتے

ہیں۔ ان کی باتوں سے کبھی کبھی گذشتہ لکھنؤ کا خیال آتا ہے۔

نواب قاسم علی خاں کا اسی دکان اور مکان پر قبضہ ہے جس میں کبھی کیفے ڈی جمیل تھا۔ تیس چالیس سال پہلے۔ بڑا شاندار ریستوراں تھا۔ ہم لوگوں کی اکثر شامیں یہاں گزرتی تھیں اور کبھی کبھی ہم لوگ دس گیارہ بجے رات کو یہاں آتے تھے۔ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ ممتاز حسین جو آجکل کراچی میں اردو کے اہم نقاد ہیں اور پاکستان انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری ہیں۔ یہ علی گڑھ میں بی۔ایڈ کرنے آئے تھے۔ لگے ہاتھوں ان کا بھی ذکر کر دوں۔ ممتاز حسین بھی ہم لوگوں کے ساتھ رہتے تھے۔ نشاط میں ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ وہاں حسن امام (جو آجکل کلکتہ میں ہیں اور بیرسٹری کرتے ہیں) ممتاز حسین، مونس رضا اور راقم الحروف رہتے تھے۔ مونس رضا اب جواہرلال نہرو یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ ہم سب ایک ساتھ رہتے تھے۔ ممتاز حسین کو ہم سب ممتاز بھائی کہتے تھے۔ بڑے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ایسے لوگ کم ہی نظر آتے ہیں۔ ایک بار الہ آباد میں نئے سال کے موقع پر انھوں نے عہد کیا تھا کہ سال بھر گھر سے باہر نہ نکلوں گا، صرف پڑھوں گا اور سچ تو یہ ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی لائبریری اور پبلک لائبریری کی بیشتر اچھی کتابیں اسی زمانے میں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں، ان کے دوستوں کا کہنا ہے کہ روزانہ تین سو سے زاید صفحات پڑھتے تھے۔ اس مطالعے نے اردو ادب کو بہت فائدہ پہنچایا۔ ان کی زبان اگر خیال سے بوجھل ہے تو اس میں ان کا قصور نہیں مجبوری ہے۔

ممتاز حسین نے بی۔ ایڈ کیا۔ کیسے کیا اللہ جانتا ہے یا ہم لوگ۔۔۔ ان کا وہ آرام کا سال تھا۔ انھوں نے "دیوان غالب" خریدا اور جتنے دن وہ علی گڑھ رہے صرف وہی پڑھتے رہے۔ ایک لڑکی پر عاشق ہو گئے اور اسی عشق کی بدولت بی۔ایڈ ہو گئے۔ ورنہ مجھے یقین تھا کہ وہ علی گڑھ سے یوں ہی چلے جاتے۔ یہ عشق بھی عجیب وغریب تھا، اس زمانے میں علی گڑھ

میں لڑکیاں برقع پہنتیں، اور پوسٹ گریجویٹ کلاسوں میں علاحدہ بیٹھتیں۔
بڑی دعاؤں کے بعد اگر کسی کا برقع سرک جاتا تو ایک ہلکا سا دیدار ہوجاتا۔
دیدار بھی کیا ہوتا۔ یوں سمجھیے کہ غالب کے قول کے مطابق ؎

وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے۔

ایک روز شامت اعمال ایک لڑکی برقع پہنے ممتاز بھائی کے پاس آئی اور اس نے ممتاز بھائی سے نوٹس مانگ لیے۔ چونکہ وہ اپنی کلاس کے سب سے پڑھے لکھے طالب علم تھے، ان کے استاد بھی ان کے علم کا لوہا مانتے تھے۔ لڑکی کو خیال ہوا کہ طالب علم بھی اچھے ہوں گے۔ اس نے اظہار خیال کر دیا ممتاز بھائی نے اس کی شکل نہیں دیکھی اور عاشق ہو گئے۔ اس کے لیے آنوں رات نوٹس تیار کیے۔ ایک کاپی بھر دی۔ اب تو وہ متاثر ہوئی اور اس نے باقاعدہ ان سے مدد لینا شروع کر دی۔ ممتاز حسین نے اردو میں چند بہترین افسانے بھی لکھے ہیں لیکن وہ عشقیہ خطوط نہیں لکھ سکتے۔ چنانچہ یہ فرض حسن امام، مونس رضا اور راقم الحروف نے ادا کیا۔ بہرحال یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ایک روز ہم لوگوں نے اصرار کیا کہ ممتاز بھائی ہم لوگ اتنا کام کرتے ہیں مشورے دیتے ہیں آخر ہم لوگ بھی تو آپ کی محبوبہ کو دیکھیں، چنانچہ ایک روز ہم لوگ بھی پہنچے۔ وہاں متعدد برقع پوش عورتیں تھیں۔ ممتاز بھائی سے پوچھا کہ "ان میں سے آپ کی محبوبہ کون سی ہے؟"

ممتاز بھائی خود جھینپ گئے تھے۔ کہنے لگے میں کیا بتاؤں۔ میں نے خود کون سی دیکھی ہے؟ غرض ممتاز بھائی بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ ہم لوگ ان کے لیکچر سنتے، ان کے لکھے ہوئے مضامین بھی بڑے شوق سے پڑھتے تھے لیکن ان کے شعر سننے کے لیے تیار نہ ہوتے۔ جب انھیں شعر سنانا ہوتا تو بڑے مزے میں وہ ہم لوگوں کو شمشاد لاتے اور ریاں کیفے ڈی جمیل میں لے جاتے۔ چائے کے علاوہ برفی اور نمک پارے سے تواضع کرتے

اور پھر یہ کہہ کر شروع ہو جاتے۔ "بھئی سنو ایک شعر کہا ہے۔"

ہم لوگ اکدم سے چیخ پڑتے لیکن بے بس ہوتے۔ ممتاز بھائی نے آخر ہم پر پیسے خرچ کیے کوئی مفت میں تو سنا نہیں رہے تھے اور ہم خاموشی سے شعر سنتے اور حسب دستور داد دیتے اور اپنی جان چھڑاتے۔

آج بھی جب میری نظر نواب صاحب کے مکان پر پڑتی ہے تو وہ پچھلی صحبتیں یاد آجاتی ہیں۔ لیکن ان در و دیوار کو کیا پتا کہ ان میں کیسی کیسی آوازیں گونجی ہیں۔

عام طور پر یہ کیفے ڈی جمیل رات کے دس بجے کے قریب بند ہو جاتا تھا لیکن اس زمانے کے مشہور سینیر سید ابوسعید زیدی بھی تھے۔ ان کا شہنشاہ میں طوطی بولتا تھا۔ ان کے لیے کوئی قاعدہ قانون نہیں تھا وہ کبھی کبھی رات کے ۱۲ بجے کیفے ڈی جمیل میں دستک دیتے تھے۔ ریستوراں کے بیرے دروازے کے پاس سوتے۔ میاں کی آواز سن کر جاگ جاتے تھے۔ یونیورسٹی میں ابوسعید زیدی کو سب "میاں" کہتے تھے۔ انھوں نے اس یونیورسٹی میں ۲۲ سال گزارے۔ اتنے عرصے میں ایک پوری نسل جوان ہو جاتی ہے۔

جب نتیجہ نکلنے کا وقت آتا تو ابوسعید زیدی دعا مانگتے کہ "اے اللہ تو سب کی سنتا ہے اس غریب طالب علم کی بھی سن لے بس مجھے کسی نہ کسی طرح فیل کردے۔ پاس ہونے کے لیے نہیں کہتا۔" اور فیل تو یوں بھی ہو جاتے کہ انھوں نے سائنس میں داخلہ لے رکھا تھا۔ کہا کرتے تھے کہ فیل ہونا زیادہ آسان ہے۔ پھر گھر والوں کے بے حد اصرار پر بی اے میں داخلہ لے لیا۔ اس کے بعد بھی وہ کلاسوں میں پڑھتے رہے۔ بس وہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ ان کے گھر سے روپیا آنا بند ہو گیا۔ ان کے والد سید محمد صاحب دھام پور ضلع بجنور کے بڑے اچھے طبیب مانے جاتے تھے۔ وہ ناراض ہو گئے لیکن ابوسعید کے لیے کیا فرق پڑتا

تھا۔ ان کا رہن سہن جوں کا توں رہا۔ وہ جس ہوسٹل میں چاہتے رہتے تھے۔ ان کی ہر جگہ آؤ بھگت ہوتی۔ بہر حال ان کا سارا سال گزر جاتا۔ ان کے اکثر ہم جماعت یونیورسٹی میں استاد بلکہ وارڈن تھے۔ جو بقول ان کے "حسب مراتب" کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے اور ان کی بدولت اس ہوسٹل کی ڈسپلن بھی اچھی ہو جاتی تھی جس میں وہ رہتے تھے۔

میں جس زمانے میں ام۔ اے میں پڑھ رہا تھا وہ "ولی منزل" کے باہر کے کمرے میں رہتے تھے جس میں لوزرا دھوبی کی "لوز ڈرائی کلیننگ" ہے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب اور رہتے تھے مجھے ان کا نام یاد نہیں آ رہا ہے۔ یہ پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کر کے آئے تھے جغرافیہ میں داخلہ لے لیا علی گڑھ کا یہ شعبہ ہمیشہ سے ہندستان میں انفرادی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو جغرافیہ کا پہلا ڈیپارٹمنٹ علی گڑھ میں ہی قائم ہوا تھا اور ڈاکٹر عباد الرحمٰن خاں جو آئی آر خاں کے نام سے مشہور تھے جغرافیہ میں پہلے پی اچ۔ ڈی تھے۔ وہ بھی اس شعبے کے چیرمین رہ چکے تھے۔ اس کے بعد وہ ڈپٹی ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ہو کر الہ آباد چلے گئے تھے۔ ہاں تو اس شعبے کی شہرت دور دور تھی۔ چنانچہ ابوسعید زیدی کے دوست بھی لاہور سے یہ شہرت سن کر آئے تھے۔ لیکن پھر ابوسعید زیدی کی صحبت میں کیا حال ہوا گئے ہاتھوں اسے بھی سن لیجیے۔

ایک روز میں اور حبیب تنویر ان کے کمرے میں گئے تو میاں نے اشارے سے کہا ــــ "زرا آہستہ سے" کیونکہ زور سے بولنے سے پارٹنر ڈسٹرب ہوگا۔ معلوم ہوا کہ پارٹنر امتحان کی تیاری کر رہے ہیں اور کرنا بھی چاہیے تھی۔ امتحان میں صرف پندرہ دن رہ گئے تھے۔ پھر ایسے طالبعلم کے لیے جس نے سال بھر تفریح کی ہو۔ اب جو ہماری نظر پارٹنر کی کتاب پر پڑی تو معلوم ہوا کہ "ہائی اسکول کا جغرافیہ" زیر مطالعہ ہے۔ ابوسعید

زیدی تیاری کر وا رہے تھے اور بقول خولیش "ہر قسم کی خرافات سے بچائے ہوئے تھے۔" من نکردم شمار حذر بکنید۔"

ابوسعید مجھ سے بولے "چوتھے روز انٹر کا جغرافیہ شروع ہو جائے گا اور پھر پورا ایک ہفتہ بی۔اے کے جغرافیہ کو دیا جائے گا کیونکہ اس کی کتاب ذرا موٹی ہے۔"

حبیب تنویر نے پوچھا "مگر امتحان تو پارٹنر ام۔اے کا دے رہے ہیں۔"

کہنے لگے "اس سے کیا ہوتا ہے گراؤنڈ تو تیار ہو جائے گی۔"

چنانچہ اس طرح میاں نے پارٹنر کی تیاری کرائی۔ ان کو یہ اطمینان تھا کہ بلا سے ام۔اے کا کورس نہیں پڑھا لیکن بنیاد تو مضبوط ہو گئی۔ جو لوگ ام۔اے کے نصاب سے واقف ہیں۔ وہ اس سے خاص طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

امتحان میں تو پارٹنر کو فیل ہونا ہی تھا لیکن یونیورسٹی کھلنے پر جب ہماری ابوسعید زیدی اور ان کے پارٹنر سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے "بھئی — مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا — رہا فیل ہونا تو یہ نصیبوں میں ہوتا ہے اسے کون بدل سکتا ہے۔

امیر کے اس مصرعہ کا اس سے بہتر استعمال میں نے اس کے بعد کبھی نہیں سنا۔ ابوسعید زیدی بڑے طرحدار آدمی تھے۔ تھے اس لیے کہتا ہوں کہ اب وہ بریلی میں وکالت کرتے ہیں اور ایسے بجھے بجھے سے ہیں کہ ان کو دیکھ کر کبھی خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ صاحب کبھی ابوسعید زیدی تھے۔ اب تو اپنا سا یہ بھی نہیں معلوم ہوتے۔ یونین کا الکشن تھا۔ غالباً ۴۳ء کی بات ہے۔ مختار آزاد یونین کے نائب صدارت کے امیدوار تھے۔ اس زمانے میں صدر کا نہیں نائب صدر کا الکشن ہوتا تھا صدر

وائس چانسلر یا اس کا نامزد استاد ہوتا تھا۔

ہاں تو مختار آزاد کے خاص درکرز میں میاں ابوسعید زیدی کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ الکشن ہو گیا۔ مختار آزاد یونین کے غالباً پہلے صدر تھے جن کو انگریزی بولنے میں تکلف ہوتا تھا۔ یونین کے جلسے میں سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔ کوئی طالب علم سگریٹ پی رہا تھا۔ مختار آزاد نے فوراً اسے ڈانٹا "کلوز یور سگریٹ"۔

ہاں تو جب مختار آزاد جیت گئے اور گلپوشی کا جلسہ ہوا تو مختار آزاد جب پیچھے سے اپنی کیبنٹ کے ساتھ داخل ہوتے تو لوگ اٹھ اٹھ کر دیکھ رہے تھے کیونکہ گھنگھروؤں کی آواز آرہی تھی۔ ہر ایک متحیر تھا کہ مختار آزاد گھنگھرو پہن کر کیوں داخل ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ ابوسعید نے ہاتھ میں بہت سے گھنگھرو باندھ رکھے تھے اور لفٹ رائٹ کی دھن پر بجا رہے تھے۔ مختار آزاد نے غصے میں دھم سے ایک پیر فرش پر مارا اور کھڑے ہو کر دیکھنے لگے کہ یہ آواز کدھر سے آرہی ہے مگر جیسے ہی انھوں نے پیر فرش پر مارا، گھنگھروؤں سے دھم سے ایک آواز آئی اور بند ہو گئی اور جیسے ہی وہ ڈائس کی طرف بڑھے۔ یہ آواز پھر سنائی دینے لگی اور اس وقت رکی جب مختار آزاد کرسی پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد مختار آزاد نے اپنی تقریر شروع کی اور کسی نہ کسی طرح "مائی یونین" کا یہ شاندار جلسہ ختم ہوا۔ اس میں ایک بات اور یاد آگئی۔ ان دنوں مسجد میں ہر جمعہ کی نماز میں کوئی نہ کوئی جنازہ ضرور آجاتا تھا اور امام صاحب مسجد میں نماز کا اعلان کرتے تھے کہ "بھائیو! ٹھہر جائیے، ابھی جنازے کی نماز ہوگی۔"

یہ جملہ یونیورسٹی میں بڑے زوروں میں گونج رہا تھا۔ ہاں تو جیسے ہی مختار آزاد نے جلسے کے خاتمے کا اعلان کیا، ابوسعید زیدی نے

نے پیچھے سے نعرہ لگایا: "بھائیو ٹھہر جائیے، ابھی جنازے کی نماز ہوگی"

آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس کا کیا اثر ہوگا۔ مختار آزاد ناراض ہوتے ہوئے ابوسعید زیدی کے کمرے پر گئے لیکن کچھ شکایت نہ کر سکے کیوں کہ میاں کا کہنا تھا کہ الکشن جیتا دیا گیا ہمیں اتنا حق بھی نہیں کہ ذرا سی ہوٹنگ بھی کر سکیں۔"

ابوسعید زیدی اپنی حاضر جوابی کے لیے مشہور تھے۔

ایک روز کیفے ڈی پھوس" میں میاں بیٹھے ہوئے یونیورسٹی کے اپنے بہت پرانے قصے سنا رہے تھے۔ ایک لڑکے نے "جو ایک سال پہلے علی گڑھ آیا تھا" یہ سوال بے ساختہ پوچھ لیا کہ "میاں! آپ علی گڑھ کب آئے تھے؟"

ابوسعید زیدی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے منھ کو ایک ذرا سی جنبش دے کر کہا "ونس اپان اے ٹائم۔"

ذاکر صاحب نے پھر ان سے درخواست کی کہ بہتر ہے کہ اب وہ عملی زندگی میں داخل ہو جائیں اور رسمی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیں۔ چنانچہ پھر انھوں نے بادلِ ناخواستہ علی گڑھ چھوڑ دیا اور ایسا چھوڑا کہ جیسے وہ ہمیشہ کے لیے راستہ بھول گئے۔

ذاکر صاحب قلب کے مریض تھے کہنے لگے کہ ایک بار تو مرتے مرتے بچا۔ مجھے اطلاع ملی کہ ابوسعید زیدی اور مُنّن خاں کی پارٹیوں میں جھگڑا ہونے والا ہے۔

شمشاد میں آمنے سامنے دونوں نبرد آزما ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ریوالور اور چاقو کا رواج نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس زمانے میں اس کے استعمال پر پابندی لگی ہوئی تھی۔ لڑکے لاٹھی ڈنڈے استعمال کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ لے دے کر ہاکی رہ گئی تھی۔ چنانچہ ذاکر صاحب دانس چانسلرس لاج سے مقام واردات پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ دونوں فوجیں میکڈانلڈ کی پابا پر آمنے سامنے ہیں۔ ذاکر صاحب

کا کہنا تھا کہ اگر وہ دیر سے پہنچتے تو خون خرابہ ہو جاتا۔ ڈرائیور نے گاڑی درمیان میں کر دی۔ ذاکر صاحب نے غصے سے پوچھا۔

"سعید میاں! یہ کیا ہو رہا ہے"

ابوسعید نے بلا تامل جواب دیا "تبادلۂ خیالات"

ذاکر صاحب کا کہنا تھا کہ یہ جملہ سن کر میرے اعصاب اپنی جگہ پر آ گئے، اور مجھے ہنسی آ گئی۔ پھر وہ ابوسعید اور منّن خاں کو گاڑی میں بٹھا کر لے گئے اور مجمع منتشر ہو گیا۔

لیکن اس سے ابوسعید زبیدی کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ ہونا چاہیے ابوسعید غنڈے بدمعاشوں میں نہیں تھے۔ انھیں شرارتیں کرنے کا شوق تھا اور شرارتیں ان کا پیشہ بن گئی تھیں۔ البتہ کبھی کبھی یہ شرارتیں حد سے زیادہ ہو جاتی تھیں پھر یہ بھی ہے کہ اس زمانے کے شریر لڑکوں کا آج کے لڑکوں سے مقابلہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ابوسعید کی شمشاد میں دھاک تھی۔ ان کے مذاق اور لطیفوں کا جگہ جگہ چرچا ہونے لگا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر زمانہ بدل نہ جاتا تو ان کا نام بھی مسعود ثامی کے ساتھ لیا جاتا۔ شمشاد میں وہ جس ہوٹل کے سامنے سے گزر جاتے، اس کا منیجر زبردستی ان کی خاطر مدارات کرتا۔ میں نے ان کو کبھی بل ادا کرتے نہیں دیکھا۔ کیونکہ بل ادا کرنا ان کی شان کے خلاف تھا۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ وہ شمشاد میں برابر اپنا حساب چکاتے رہے اور جب وہ یہاں سے گئے تو ان پر کسی کا حساب واجب نہ تھا۔ البتہ یہ بات میرے علم میں ہے کہ جب سن ۴۶ء میں الکشن ہوا تو نواب زادہ لیاقت علی خاں ان کو اپنے الکشن کے لیے لے گئے۔ اور ابوسعید نے اپنے پاس سے ہی روپیا خرچ کیا۔ اور نواب زادہ کو مقروض کر کے بے حد خوش ہوئے اور اس کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔ الکشن کے بعد جہاں کہیں کسی جلسے میں ملاقات ہوتی تو خود

ہی باتیں کرتے اور پھر بڑے آہستہ سے اپنا حساب یاد دلا دیتے ۔ وہ یہی کہتے کہ سکریٹری سے لے لیجیے مگر ابوسعید کبھی نہ لیتے تھے ۔ ایک بار نواب زادہ لیاقت علی خاں نے انھیں روک لیا اور بولے " ابوسعید ذرا ٹھہرو آج تمھارا حساب ادا کر دوں " سکریٹری کو بلایا ۔ تب ابوسعید نے بڑی نیازمندی سے کہا ۔ " نواب صاحب! مجھے خوشی ہے کہ اس بہانے آپ کو میرا نام یاد ہو گیا لیکن پاکستان بننے کے بعد بھی مجھے یاد رکھیے ۔ شاید کبھی ادھر آنا ہو ۔ میں اسی لیے تقاضا کرتا تھا ورنہ اس روپے کو تو میں چندہ سمجھتا ہوں "

نواب زادہ بھی اس پر خوب ہنسے ۔

ابوسعید کے ساتھ اگر کوئی جونیر ہوتا اور وہ اپنا پرس نکالتا تو ابوسعید کا ہاتھ اٹھ جاتا ۔ ہمارے ساتھ کبھی الیسا مت کرنا ۔ تم ابھی بچے ہو ۔ میں تو اپنے سینیریوں کا قرض ادا کر رہا ہوں ۔ جب تم سینیر ہو جانا تو تم یہ قرض ادا کرنا "

خیر یہ تو اس زمانے کی عام رسم تھی جس میں ابوسعید کی کوئی خاص تخصیص نہ تھی ۔ سینیر طالب علم ہی بل ادا کرتا تھا اور جونیر طالب علم یہ سوچا کرتا تھا کہ خدا جانے کب اس لائق ہوں گے کیونکہ جونیر کا معاملہ برادرِ خورد کا تھا ۔ یہ علی گڑھ کی وہ تربیت تھی جس کے بعد کوئی شخص کنجوس نہ ہو سکتا تھا ۔ علی گڑھ کے پرانے طالب علموں پہ شاید اور الزام لگائے جا سکیں لیکن کنجوسی ان کے مزاج کے خلاف تھی ۔ وہ دوسروں پر پیسہ خرچ کر کے خوش ہوتے تھے ۔

مجھے جب ابوسعید کا خیال آتا ہے تو ہمیشہ اختر الایمان یاد آتے ہیں ۔ اسی زمانے میں اختر ، دہلی سے علی گڑھ آئے تھے ۔ انھوں نے اردو ام ۔ اے میں داخلہ لیا تھا یہ زمانہ وہ تھا جب انھیں شعر کہتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن علی گڑھ میں وہ اپنا مجموعہ کلام (گرداب) لیے ہوئے داخل ہوئے ۔ ادبی حلقوں میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی ۔ لیکن ترقی پسند حضرات ایک مشکل میں پڑ گئے تھے ۔ اختر الایمان کی شاعری ، کو عام طور پہ ان کی گفتگو سے سمجھنے

کی کوشش کرتے تھے اد۔ بات چیت کے اعتبار سے وہ قنوطیت کو اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ ان کی نظمیں ادبِ لطیف، ادبی دنیا، اور ساقی وغیرہ میں بڑے طمطراق سے چھپتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وامق جونپوری، حسن امام، مونس رضا اور راقم الحروف نئے نئے ترقی پسند ہوئے تھے۔ اس میں ذہنی قیادت تو ممتاز حسین کی تھی لیکن عملی تحریک میں معبود حسن لائے تھے۔ چنانچہ اس وقت بڑا جوش و خروش تھا ہم لوگ کمیونسٹ پارٹی کا لٹریچر اور اس کا اخبار "قومی جنگ" بڑے انقلابی انداز سے بیچا کرتے تھے۔ "نشاط" کی عیش و آرام کی زندگی اس تبدیلی کا پہلا شکار ہوئی تھی۔

اس زمانے میں کمیونسٹ دشمن استادوں میں بابر مرزا مرحوم پیش پیش تھے۔ پروفیسر مرزا آفتاب ہال کے پرووسٹ تھے اور ترقی پسند طالب علم ان کے عتاب کا اکثر و بیشتر شکار رہتے تھے۔ بیگم مرزا، جرمن خاتون تھیں اور مشہور تھا کہ وہ ہٹلر کی عزیزہ بھی تھیں اور شاید اسی لیے ڈاکٹر مرزا کو ہٹلر سے ہمدردی تھی اور اس لحاظ سے کمیونسٹوں پر ان کا عتاب بھی حق بجانب تھا۔ ڈاکٹر مرزا کو پتا چلا کہ کمیونسٹوں کا اخبار کمرے کمرے پہنچتا ہے تو انھوں نے رات کے وقت ہوسٹلوں میں سختی کر دی اور کبھی کبھی خود بھی گشت لگاتے لیکن ان کو پتا نہ چلتا کہ اخبار کس وقت کمروں میں پہنچتا ہے اور پتا بھی کیسے چلتا، اخبار تو دن دہاڑے تقسیم ہوتا تھا۔

مختار آزاد کسی بات پر پروفیسر مرزا سے خفا ہو گئے اور انھوں نے ایک "اینٹی فاشسٹ لیگ" بنا ڈالی۔ اس کا دفتر ان کا اپنا کمرہ بن گیا۔ اس زمانے میں دو روپے میں لیٹر پیڈ چھپتا تھا۔ شمشاد میں اختر پرنٹنگ سے ہاتھ کے ہاتھ پیڈ اور کارڈ چھپوا لیا گیا۔ گویا باقاعدہ جماعت بن گئی۔ خود مختار آزاد اس کے صدر بن گئے اور سیدھے نئی دلی پہنچے ـــــ مختار آزاد تیز آدمی تھے۔ براہِ راست وائسرائے تک رسائی حاصل کی، اور خدا جانے

صدر "اینٹی فاشسٹ لیگ" کی حیثیت سے کیا کچھ کہا۔ لڑائی کا زمانہ تھا۔ انگریزی حکومت ہر قسم کی احتیاطی تدابیر کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھی چنانچہ حکومت کی مشینری فوراً حرکت میں آ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اگر یونیورسٹی کا وائس چانسلر سر ضیاء الدین احمد جیسا شخص نہ ہوتا تو پروفیسر مرزا کے ہتکڑیاں پڑنے میں کوئی کسر نہ رہ گئی تھی۔ بمشکل تمام قصہ رفع دفع ہوا لیکن اس معاملے میں کمیونسٹوں کا کوئی ہاتھ نہ تھا کیونکہ ہم لوگ مختار آزاد سے بخوبی واقف تھے۔

توجناب بات اختر الایمان سے شروع ہوئی بیچ میں پروفیسر بابر مرزا اور مختار آزاد داخل ہو گئے۔ اختر الایمان سے میرے ذاتی تعلقات تھے۔ میں ان کو اپنا عزیز سمجھتا تھا۔ ان کی اکثر شامیں میرے یہاں گزرتی تھیں۔ میں اختر الایمان کی شاعری کو بڑی محنت سے پڑھتا اور ان کی سیاسی توضیح کیا کرتا تھا جس پر مونس رضا مجھ سے کبھی کبھی ناراض ہو جایا کرتے تھے کیونکہ وہ تو ہم دونوں ایک ساتھ نئے نئے ترقی پسند ہوئے تھے لیکن وہ میرے مقابلے میں "پیاز ذرا زیادہ کھاتے تھے"، اور ایسے معاملات میں کسی کی رُو رعایت نہ کرتے تھے۔ حسن امام بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کی تنقید برداشت نہ کر سکے اور میرے کمرے میں آئے اور اپنی بیاض نذر آتش کر دی عین وقت پر میں دوڑ پڑا اور میں نے ادھ جلی بیاض بچالی۔ جب مونس آئے اور انھوں نے یہ جلی ہوئی بیاض دیکھی تو جیب سے قلم نکال کر اقبال کا یہ شعر لکھ دیا ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

حسن امام نے اس روز سے شعر کہنا ترک کر دیا۔ ان کی یہ بیاض آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔ حسن امام نے ایک بہت اچھا ناول لکھا تھا وہ بھی اس شدت پسندی کی نذر ہو گیا۔ احتشام صاحب نے بھی پڑھا تھا اور وہ

اکثر مجھ سے اس ناول کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے۔ مونس رضا اور معبود حسن کی شدت پسندی کا کسی حد تک اختر الایمان بھی شکار تھے۔ اختر الایمان نے "قحط بنگال" پر نظم لکھی جس کے آخری مصرعے مجھے یاد رہ گئے ہیں۔

اسی لیے کیا اگا کریں گے یہ نرم پودے یہ نرم شاخیں
کہ ان کو اک روز ہم اٹھا کر
خزاں کی آغوش میں سُلا دیں۔

میں اس نظم کو لے کر مونس رضا کے پاس گیا۔ مونس نے کچھ اس طرح کہا جیسے کسی معمولی طالب علم کو سفارش پر کوئی استاد، نمبر دے کر پیچھا چھڑائے در اصل ترقی پسندوں کا یہ زمانہ اچھا خاصا کٹھ ملائیت کا زمانہ تھا۔ اور میں اختر الایمان کی شاعری کا ڈیفینس محض اس لیے پیش نہیں کرتا تھا کہ میں اختر الایمان کی جان بچاؤں۔ مجھے تو اپنی عزت آبرو کا خیال تھا۔ میں مونس رضا اور معبود حسن کے رویے سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ اور قابل ذکر ہے۔ اختر الایمان نے ایک نظم "دستک" لکھی جو مجھے آج تک یاد ہے۔ لکھتے ہی میرے پاس آئے، مجھے سنایا۔ میں نے بے انتہا تعریف کی۔ نظم آپ بھی سنیے۔

کھٹکھٹاتا ہے درِ خفتہ کوئی
انتظار اشک گماں کچھ بھی نہیں
شمع پروانے دھواں کچھ بھی نہیں

سوچ لوں باز کروں در نہ کروں
شیشہ و سنگ کی آواز سنوں
آج کیا کہتے ہیں غمخوار رستوں

اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا
اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا
اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا

میری بے انتہا تعریف پر اختر الایمان کو حیرت ہوئی کہنے لگے "تم کیا سمجھے؟"
میں نے کہا انسانیت ایک کمرے میں بیٹھی انتظار کر رہی ہے، لیکن اس سے پہلے بھی عہد فطرت، عہد جاگیرداری اور عہد سرمایہ داری مایوس کر چکے ہیں اب یہ پس و پیش میں ہے کہ اس کے لیے دروازہ کھولوں یا نہ کھولوں۔

معلوم نہیں کہ اختر الایمان کے ذہن میں اس کا کیا مطلب تھا وہ میری بات پر اچھل پڑے انھوں نے ایک پیالی ٹھنڈی چائے اور پی، جو وہ بڑے شوق سے پیتے تھے۔ پھر جب ہم لوگ دہلی میں آل انڈیا ریڈیو گئے تو اختر الایمان نے میری ملاقات مختار صدیقی، منٹو، ن۔م۔ راشد اور میراجی سے کرائی۔ خاص طور پر میراجی سے۔ ایک رات ہم لوگوں نے ان کے یہاں قیام بھی کیا۔ میراجی سے "دھنک" کا ذکر آیا۔ انھوں نے اسے طوائف کا انتظار بتایا۔ لیکن میرے مطلب کو سنا تو اور خوش ہو گئے۔ وہ رات میں کبھی نہیں بھول سکتا جب اختر الایمان، میراجی، اور مختار صدیقی سے ایک ساتھ اقبال کی شاعری پر تقریباً چار گھنٹے بحث ہوئی۔ اس روز میراجی نے زیادہ نہیں پی تھی۔ میں حیرت میں رہ گیا کہ میراجی مارکسی نقطہ نظر کی روشنی میں اقبال کے کلام کو جانچ رہے تھے۔ میں اس وقت میراجی کی شاعری کے بارے میں تو کچھ کہنا نہیں چاہتا لیکن ان کے خیالات خاصے ترقی پسند معلوم ہوتے تھے اور مطالعہ گہرا۔

میراجی کے کمرے میں ہر طرف کتابیں بکھری پڑی تھیں بجلی نہیں تھی۔ موم بتی جلی تو معلوم ہوا کہ دو جھلنگے پڑے ہیں اور ان پر ہر طرف کتابیں بکھری ہوئی ہیں۔ میراجی نے بڑے سلیقے سے دونوں چارپائیوں کی کتابیں ایک

اک طرف کیں اور چار پائی پر اتنی جگہ کر دی کہ میرے اور اختر الایمان کے لیے جگہ نکل آئی۔ تکیے کا کام کتابوں نے کیا۔ بڑی گہری نیند آئی اور صبح جب آنکھ کھلی تو میرا جی بیٹھے پان لگا رہے تھے۔ وہ دہیں فرش پر سوئے تھے اور اٹھنے کے بعد شاید ان کا پہلا کام تھا۔ اگلے روز ہم لوگ علی گڑھ واپس آگئے۔

اختر الایمان نے داخلہ تو لے لیا تھا لیکن مستقل طور پر کہیں سے منی آرڈر نہیں آتا تھا۔ یوسف میں بھی پریشان تھا۔ شاہد احمد دہلوی ان کو سہارا دیا کرتے تھے۔ آخر اس طرح گاڑی کیسے چلتی۔ البتہ ایک دلچسپ بات ہے کہ جب ان کے پاس سگریٹ کے پیسے نہ ہوتے تو وہ پائپ پیا کرتے۔ اس کا راز اس طرح سمجھ میں آیا کہ ایک روز جو میں گیا تو وہ سگریٹ کے ٹڑے جمع کر کے ان کا تمباکو نکال رہے تھے۔ اور پھر بڑے شان سے انھوں نے پائپ پیا خیر ٹڑے کے تمباکو سے پائپ تو پیا جا سکتا تھا لیکن دوسرے اخراجات کیسے چلتے۔ ایک روز وہ چپ چاپ علی گڑھ سے چلے گئے اور بہت دنوں تک میرے کمرے میں سناٹا رہا۔

میں بات اختر الایمان اور ابو سعید زیدی کی کر رہا تھا۔ اختر الایمان بہت اچھے مقرر تھے یونین میں ان کی پہلی تقریر ہونے والی تھی۔ مجھے بھی شریک ہونا تھا۔ کیونکہ علی گڑھ میں پہلی تقریر پر مقرر کی پوزیشن کا تعین کیا کرتی تھی۔ اتفاق کی بات ہے ڈاکٹر ہادی حسن کلاس لے رہے تھے جب وہ پڑھانے پر آتے تو گھڑی دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا چنانچہ جب ان کا کلاس ختم ہوا تو اس وقت اختر الایمان کی تقریر ختم ہو چکی تھی۔ میں سیدھا موریسن کورٹ میں ان کے کمرے میں پہنچا کہنے لگے کوئی سینیر ابو سعید زیدی تھے انھوں نے خوب ہوٹنگ کی بار بار شعر سنانے کی فرمائش کرتے تھے۔ سارا کھیل بگاڑ دیا۔ ابو سعید زیدی میری عزت

کرتے تھے، ان کو جب معلوم ہوا تو بڑے شرمندہ ہوئے، معذرت کی اور
کہا اگلی تقریر ہو جائے، دیکھیے کیا اہتمام کرتا ہوں۔ قصہ کوتاہ جب اگلا
ڈیبیٹ ہوا تو ابوسعید زیدی اپنی پوری جماعت کے ساتھ وہاں موجود تھے
اور اختر الایمان بھی موڈ میں تھے۔ ہال میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اختر الایمان نے
ایسی تقریر کی کہ ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ اگر الفاظ دیوار پر چپک جایا کرتے تو
میں ان کو کھرچ کھرچ کر آپ کے سامنے پیش کرتا اور آپ بھی ۱۹۴۳ء کی ایک
شاندار تقریر اپنے کانوں سے سن لیتے۔

در اصل بات شروع ہوئی تھی کیفے ڈی جبیل سے اور پہنچ گئی ابوسعید
زیدی، مونس رضا، ممتاز حسین، اختر الایمان اور میراجی تک۔ لیکن بات یہ
ہے کہ شمشاد کو یونیورسٹی سے الگ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ راج گھاٹ کو گاندھی
جی سے۔ یونیورسٹی اور شمشاد کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہاں تو نواب صاحب کے
مکان اور دکان کا معاملہ بھی کچھ عجیب سا ہے۔ نواب صاحب دکان چلانے
پر مجبور ہیں۔ اس کو گھر میں نہیں تبدیل کر سکتے ورنہ ابن علی ان کو دکان سے
بے دخل کر دیں گے۔ چنانچہ یہاں انھوں نے مختلف دکانیں چلائیں۔ ایک زمانے
میں یہاں جنرل مرچنٹ کی دکان تھی۔ جس کے جنرل منیجر ماموں تھے۔ دکان تو
خیر کیا چلتی، ان کا قبضہ محفوظ تھا۔ پھر انھوں نے سیلون اسٹار ریسٹوران"
کھولا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ انھوں نے اپنی سات لڑکیوں کی رعایت سے یہ
نام رکھا تھا۔ لیکن میرا اس پہ نہیں ماننا کیونکہ لڑکیوں کی تعداد میں ٹھہراؤ
کہاں ہو سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے آدمی اتنا غیر یقینی نام نہیں رکھ سکتا جس کو
روز بدلنا پڑے۔

نواب صاحب کو نندلیوں کا بڑا شوق ہے۔ اور ان کے بچے ہندستان
سے پاکستان تک ہیں۔ بنگلہ دیش کے بارے میں بس کہہ نہیں سکتا۔
انھوں نے ایک زمانے میں پرانی موٹروں کا کاروبار بھی کیا ہے ان

کی نیک نفسی اور سادہ لوحی کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ وہ میکینک پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ جو ان کی گاڑیاں اونے پونے بیچ دیتے ہیں۔ اور ان کو اطمینان دلاتے ہیں کہ یہ جو رقم مل سکی اس کو منافع سمجھیے۔ اور نواب صاحب خوش ہو جاتے ہیں۔ گھر کے رئیس ہونے میں یہی تو فائدہ ہے کہ آدمی کا دل نقصان سے آزردہ نہیں ہوتا۔

اب بھی کبھی کبھی نواب صاحب کے یہاں کوئی پرانی کار نظر آجاتی ہے جس کے پہیے زمین میں دھنسے ہوتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ بہت جلد فروخت بھی ہو جاتی ہے۔

نواب صاحب شمشاد کی زندگی کا ضروری جزو ہیں۔ وہ وہاں رہیں یا نہ رہیں، لیکن جب بھی کہیں جانتے ہیں تو ایسے آثار نظر آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب آس پاس یہیں کہیں ہیں۔ ان کے بچے بڑے پیارے ہیں، آپ شمشاد میں کہیں بھی جائیں، آپ کو دس سال تک کے کئی گورے گورے بچے بازار میں نظر آئیں گے۔ اور یہ معلوم ہوگا کہ نواب صاحب کے بچے ہیں۔ اگر کوئی شخص پانچ پانچ سال کے وقفے کے بعد جائے تو یہی سوچے گا کہ یہ بچے کبھی بڑے نہیں ہوتے۔ ان کی نشو ونما رک گئی ہے۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے بہرحال یہ بچے بھی شمشاد کی زندگی اور اس کی رونق کا ایک اہم حصہ ہیں۔ اللہ ان کو عمر خضر عطا کرے۔

نواب صاحب سے ملی ہوئی زرا گلیارے کے پاس رام داس کی دکان ہے۔ دکان کے لفظ سے پھر آپ دھوکہ نہ کھائیں۔ یہ بھی ایسے ہی چند تختوں کے باہمی ربط کا نتیجہ ہے۔ یہاں رام داس اور اس کا بیٹا کھیل کا سامان بیچتے ہیں۔ بیچتے تو کیا ہیں کھیلتے ہیں۔ انھیں کوئی نہ کوئی اپنا جیسا مل جاتا ہے مثلاً بشیر صاحب گھر سے نکلتے ہیں تو کہتے ہیں کہ زرا دکان میں بیٹھا ہوں۔ دن کے وقت ان کے دکان میں بھی کیا کام۔ پان کھانے

والے تو شام کو آتے ہیں۔ چنانچہ اکثر و بیشتر وہ رام داس کی دکان میں بیٹھے شطرنج کھیلتے نظر آتے ہیں۔ ان کے ساتھ دو ایک آدمی اور دکھائی دیتے ہیں جن کا میں اچھی طرح صورت آشنا ہوں۔ البتہ ناموں سے واقف نہیں ہوں۔ یہ تماشائی خود کبھی نہیں کھیلتے صرف دیکھتے ہیں۔ شطرنج کی بنیادی شرط بھی یہی ہے کہ خاموشی سے کھیلا جائے۔

میرے دوست کنور رنبیر سنگھ۔ اپنے جے پور کے ایک شاطر استاد کا قصہ سنا رہے تھے۔ کہ وہ کھیل رہے تھے اور دیر سے مہرے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ کہ ایک "تماش بین" نے آہستہ سے چال بتائی۔ استاد کو غصہ آ گیا اور انھوں نے اکدم کھڑے ہوکر زنّاٹے سے اس کے طمانچہ مار دیا۔ سب خاموش کھڑے تھے کسی کو شکایت نہ تھی کہ استاد نے اتنی ذرا سی بات پر اتنے زور کا طمانچہ مار دیا ہے۔ لیکن اس تماشائی کے ماتھے پر ایک بھی بل نہ تھا۔ اسے کوئی شکایت نہ تھی۔ اس نے کہا "ایک چانٹا چاہے اور مار دیجیے لیکن چال تو وہی ہے۔"

تو صاحب ایسے ہوتے ہیں صاحب ذوق۔ ہمارے رام داس اور بشیر صاحب کا کھیل بھی گھنٹوں چلتا ہے۔ میں یونیورسٹی جاکر واپس آ جاتا ہوں، لیکن ان کا کھیل کبھی نہیں ختم ہوتا۔

رام داس شمشاد کی دائی ہیں۔ ان سے آپ یہاں کا سارا حال پوچھ سکتے ہیں۔ پیدائش سے لے کر اب تک کا۔ انھوں نے بڑے بڑے سرد و گرم دیکھے ہیں۔ ان کا کاروبار نہیں چلتا لیکن مجھے یقین ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ شمشاد چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ شمشاد کی تو چاٹ ہی کچھ ایسی ہے۔

یہیں یونیورسٹی کی شاندار دکان ہے۔ "اسٹوڈنٹس اسٹیشنری مارٹ"۔ زیدی صاحب نے یہ دکان کھلوائی تھی۔ زیدی صاحب نے خدا جانے کیا کیا

سوچا تھا۔ لیکن اب یہ کچھ اور ہو گئی ہے۔ البتہ زیدی صاحب کی تصویر
ان مقاصد کو ضرور یاد دلاتی ہے، جو اس دکان میں لگی ہوئی ہے۔ یہ دکان
یونیورسٹی کے بل بوتے پر چل رہی ہے کیوں کہ یونیورسٹی کا سارا اسٹیشنری
کا خرچ یہیں سے چلتا ہے اور دفاتر یہاں سے خریدنے پر مجبور ہیں بہرحال
یونیورسٹی کے دفاتر کی سپلائی پر اس دکان کی زندگی کا دارومدار ہے۔
حافظ صاحب بڑے حسن و خوبی سے اس کام کو چلا رہے ہیں۔ شروع
شروع میں جب یہ دکان کھلی تو شمشاد میں کھلبلی مچ گئی۔ میں بھی اس
کمیٹی کا ایک رکن تھا۔ لیکن جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ اس دکان کا تعلق
خریداروں سے نہیں، دفتروں سے ہے تو یہ خاموش ہو گئے۔ یہاں کئی کارکن
ہیں کیونکہ یونیورسٹی کا بڑا کام خاصا بڑھا ہے۔ دن بھر بیٹھے بیٹھے کاغذات
کی خانہ پری کرتے کرتے تھک جاتے ہیں اس لیے اگر کوئی بھولا بھٹکا فیشن
ایبل خریدار آ جاتا ہے تو ان کا جی بھی تھوڑی دیر کے لیے بہل جاتا ہے۔
اسٹیشنری مارٹ کی دکان شمشاد میں کچھ بے جوڑ سی لگتی ہے۔ اس میں شیشے
کی خوبصورت الماریاں ہیں۔ اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں داخل ہو کر
آدمی کا شمشاد سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ دکان بیچ بازار میں ہوتے
ہوئے بھی الگ تھلگ ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں پہلے عابدی صاحب کا ٹیلرنگ
اسکول تھا۔ اور آزادی سے پہلے "اسٹوڈنٹس اون کینٹین" تھا۔ شاید عابدی
صاحب کا روحانی اثر ہے کہ یہ دکان بازار میں اس طرح ہے جیسے کنول پانی
میں رہ کر پانی سے بے نیاز رہتا ہے۔
بہرحال ان دونوں کے لیے ایسی دکان کا شمشاد میں ہونا بھی ضروری ہے تاکہ
نئی دنیا اور پرانی دنیا کا فرق ہماری گرفت میں آ سکے یا کم سے کم سمجھ میں آ جائے۔ یہاں سامنے
نیم کا ایک درخت تھا۔ جو میونسپلٹی کے کارندوں کی مہربانی کی بنا پر کٹ
گیا۔ اس لیے اس دکان کے آگے کیا پڑتی ہے کہ پوری دکان پر کھوکھے کی

بھی ہو جاتی ہے۔ یہ حافظ صاحب اور ان کے رفقاے کار کی ہمت ہے کہ اس کے "بادصف" وہ اندر بیٹھے رہتے ہیں۔

شمشاد کے ایک اہم کردار مولانا عشرت ہیں۔ ان کی جوتے کی دکان ہے جس پر "شوکو" لکھا ہوا ہے۔ ویسے تو عشرت صاحب مولانا نہیں ہیں۔ لیکن داڑھی کی وجہ سے لوگ ان کو مولانا کہنے لگے۔ داڑھی کا معاملہ بھی عجیب و غریب سا ہے۔ یونیورسٹی میں لڑکوں پر اچانک داڑھی کا ایسا بھوت سوار ہوا کہ جس طالب علم کو دیکھیے داڑھی رکھ رہا ہے۔ یونیورسٹی کا فیشن دیکھنا چاہیں تو شمشاد میں تھوڑی دیر کھڑے ہو جایئے فیشن کا اندازہ ہو جائے گا۔

یہاں ایک وقت ایسا آیا کہ داڑھی رکھنا ایک فیشن میں آ گئی تھی۔ ایک روز کسی ایسے ہی داڑھی والے طالب علم نے کسی اجنبی سے کوئی سبک بات کی۔ جس پر اجنبی کو حیرت ہوئی کہ اتنا متقی آدمی اور ایسی گھٹیا بات کر رہا ہے۔ چنانچہ اجنبی نے ان پر اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "آپ کی داڑھی کو دیکھتے ہوئے آپ کو یہ بات زیب نہیں دیتا۔"

طالب علم مسکرائے اور بولے "جناب! یہ وہ داڑھی نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔"

اسی طرح عشرت صاحب کی داڑھی یا ان کے نام سے پہلے مولانا کا ہونا آپ کو کسی غلط فہمی میں ڈالنے کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ مولانا عشرت کی دکان ہے۔ یہ میرے پڑوسی بھی ہیں۔ اور اسد یار خاں کے گھر کے نیچے ان کی دکان ہے۔ بہت اچھے جوتے بناتے ہیں۔ یونیورسٹی کے لڑکے ان کے ہاتھ کے جوتے پہننا پسند کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ان کا کام نہیں چلتا۔ انھوں نے لاکھوں لاکھ جتن کیے۔ مگر دکان جہاں تھی وہیں کی وہیں رہی۔ ایک انچ آگے نہیں بڑھی۔ اور عشرت صاحب بہت پریشان ہوتے ہیں تو اپنے بھائیوں کو یاد کرتے ہیں۔ جو پاکستان میں بہت بڑے بڑے

مناصب پر کام کر رہے ہے۔ کسی کے پاس گیڈ ہے اور کسی کے پاس مزید ہے۔ عشرت صاحب خود تکلیف اٹھاتے ہیں لیکن اپنے بوا تیوں کی خوشحالی سے خوش ہوتے ہیں۔ ان کی صحت خراب ہے وہ اکثر بیمار رہتے ہیں۔ لیکن اپنی ذمہ داریاں کو پہلے سے زیادہ ذمہ داری سے نباہتے ہیں۔ پہلے بہت باغ و بہار آدمی تھے لوگوں کی خاطر و مدارات کر کے خوش ہوتے تھے۔ انھوں نے بڑا اچھا وقت گزارا ان کے شہر میں متعدد دکان تھے لیکن زمانے کے ہاتھوں سب بک چکے ہیں۔ ان کو لوگوں نے بہت رائے دی کہ وہ پاکستان چلے جائیں لیکن حب الوطن بہرحال ملک سلیمان سے زیادہ خوشتر ہے۔ وہ ایک بڑی دکان کے منتشر خواب دیکھتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ شمشاد کے لیے اس سے زیادہ موزوں کوئی اور دکان نہیں ہے۔

مولانا عشرت کی دکان کے بعد کی بسکٹ مکھن وغیرہ کی دکان ہے۔ یہ بھی اسی طرح بے در و دیوار کی ایک دکان ہے۔ لیکن ہر وقت یہاں دو چار خریدار ضرور رہتے ہیں۔ یہ مکھن، بسکٹ، ڈبل روٹی اور ٹانی جیسی خوردنی اشیاء کی صاف ستھری دکان ہے۔ پہلے اس کے مالک معین تھے جنھیں بچے معین چاچا کہتے تھے۔ وہ بچوں کو ٹانی اور بسکٹ تو دیتے ہی تھے لیکن اس کے ساتھ پیار بھی۔ ایک بار کوئی جھگڑا ہو گیا جس میں معین چاچا بھی ملوث ہوگئے انھوں نے بہتری اس میں سمجھی کہ شہر میں دکان کرلیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ دکان نیاز میاں کے ہاتھ بیچ دی، جنھیں لوگ نیاز بھائی کہتے ہیں۔ لیکن یہ معین چاچا کی دکان کہلاتی ہے۔ ان کے زمانے کے بچے اب جوان ہو گئے ہیں۔ اسی لیے یہ نام اتنے دنوں تک چلا۔ بالکل نئی نسل اب بھولتی جا رہی ہے۔ نیاز بھائی کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ یہ دو بھائی ہیں اور دونوں نیاز بھائی کہلاتے ہیں۔ ایک نیاز بھائی اسی دکان میں کاروبار کرتے ہیں جو کبھی معین چاچا کی دکان تھی۔ دوسرے نیاز بھائی نے ایک دوسری دکان عاقل میاں

کی دکان کے پاس لے لی ہے۔ یہ بے درو دیوار کی دکان ہے لیکن خوب چل رہی ہے کیونکہ شمشاد میں یہ اکیلی دکان ہے جو انٹرنیشنل ہے۔ انٹرنیشنل اس لیے کہ نیاز بھائی اپنے گاہکوں سے ان کی مادری زبان میں گفتگو کرتے ہیں ان کو ہفت زبان کہنا بھی ان کی استعداد کے ساتھ پورا انصاف نہیں کرتا۔ یہ انگریزی، فرانسیسی، روسی، عربی، فارسی، تھائی، کے علاوہ افریقہ کی متعدد زبانوں سے واقف ہیں غرض جس زبان کا گاہک ہوتا ہے اس سے اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ شمشاد انٹرنیشنل شاپنگ سنٹر ہے۔ مختلف ممالک کے تقریباً ایک ہزار طالب علم جو علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں، شاپنگ شمشاد میں کرتے ہیں اور نیاز بھائی کے یہاں ان کو سب سے زیادہ تسکین حاصل ہوتی ہے کہ دکاندار اس سے اس کی اپنی زبان میں گفتگو کرتا ہے اس لیے وہ فارن اسٹوڈنٹس میں بے حد مقبول ہیں۔

نیاز بھائی سے ملی ہوئی عاقل میاں کی دکان ہے۔ ترکاری کی دکان پر یہ محض نام کے ہی عاقل نہیں ہیں کام میں بھی اس کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ یہ اسمٰعیلیہ بلڈنگ کے پچھلے حصے میں رہتے ہیں۔ انھوں نے فارن اسٹوڈنٹس کے لیے ایک میس کھول لیا ہے جو ماشاءاللہ خوب چل رہا ہے۔ غیر ملکی طالب علموں کے سامنے کھانا ایک بہت بڑا مسئلہ تھا جو عاقل میاں کی بدولت خوش اسلوبی سے حل ہو گیا۔ بہرحال دونوں فریق خوش ہیں۔ اسی لیے عاقل میاں نے سبزی کی دکان کی طرف توجہ بھی کم کر دی ہے۔

آپ یہ نہ سوچیے کہ شمشاد میں صرف چیزیں ہی فروخت کی جاتی ہیں، چیزیں کرائے پر بھی ملتی ہیں۔ جیسے یہاں سائیکل کی دکانیں ہیں جہاں آپ چار آنے فی گھنٹے کے حساب سے سائیکل کرائے پر لے سکتے ہیں۔ ورنہ رکشا کر کے بیٹھ تو علی گڑھ میں [illegible] ہیں کہ ٹیکسی کار کا شبہ ہوتا ہے۔ بالکل آخری سرے پر سلطان جہاں منزل کے پھاٹک کے سامنے لکڑی کے کھوکے کے پاس یونس کی دکان

ہے۔ پہلے پولیس کی اس دکان ... سائیکلوں کی مرمت کا کام ہوتا تھا۔ اب پولیس نے یہاں پان بیڑی سگریٹ کی دکان کرلی ہے۔ اب سے سولہ سترہ سال پہلے یہاں خالد بھائی کی دکان تھی۔ ایک زمانے میں شمشاد میں خالد بھائی کا طوطی بولتا تھا۔ بعض لوگ انہیں شمشاد کا دادا سمجھتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ شمشاد کے خالد بھائی تھے۔ بڑے تندرست۔ کھانے پینے کے شوقین ___ کھانے کا یہ شوق انہیں ورثے میں ملا تھا۔ ان کے والد عزیز صاحب مرحوم، یونیورسٹی میں ریاضی کے لکچرر تھے۔ یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ اور گھر میں کھاتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یونیورسٹی میں پچھلے چند برسوں میں تو کھانے کا ایسا شوقین نہ رہا تھا۔ اگر آپ نے ان کا گھر نہ دیکھا ہو اور کوئی آنکھوں میں پٹی باندھ کر یونیورسٹی کے تمام استادوں کے گھر کے سامنے سے گزار دے تو۔ مجھے یقین ہے کہ ایک جگہ رک کر آپ یہ ضرور کہہ دیں گے کہ یہ عزیز صاحب کا گھر ہے۔ پوری فضا کھانوں کی خوشبو سے لبسی ہوئی ہوتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ... کے گھر کے سامنے کی مٹی میں کبھی سالن کی خوشبو لبسی ہوئی ہوگی۔ عزیز صاحب رکشا میں بیٹھ کر جاتے اور قصاب کے یہاں اپنے سامنے صحیح جگہ کا گوشت نکلوا کر کٹوا کر لاتے۔ اور بڑے اہتمام سے پکواتے۔ سنا ہے کہ پھر باپ بیٹے بڑے شوق سے اک اک بوٹی ڈھونڈ ڈھونڈ کر کھاتے۔ علی گڑھ میں شاید ہی کسی گھر میں اتنے شاندار شامی کباب پکتے ہوں۔ میں یہ بات کباب کے معاملے میں تو وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ باقی اور چیزوں کے معاملے میں میری معلومات کے ذرائع ذاتی تجربہ کی بنا پر نہیں بلکہ باوثوق شہادت پر مبنی ہیں۔

خالد بھائی نے پڑھنے پڑھانے میں کبھی زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ ان کا بیشتر وقت خدمت خلق میں گزرتا۔ اس زمانے میں حیدر آباد سے لڑکے اور لڑکیاں ہائی اسکول کا امتحان دینے آئے تھے۔ شروع شروع میں

یونیورسٹی کی طرف سے رہائش کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ عام طور پر لڑکیاں ایک (نائیک) کو لے کر آ جاتیں)۔ ان کا قافلہ عام طور پر شاہدرہ میں آ کر رکتا اور پھر ان) کے مہینہ ڈیڑھ مہینہ قیام کے لیے کمروں کی تلاش ہوتی۔ خالد بھائی ایسے وقت میں ان کے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوتے۔ وہ لڑکیوں کے لیے گھر گھر جا کر کمرے کا انتظام کرتے۔ اس کے بعد پھر ان کی پڑھائی کی طرف توجہ دیتے اور ہر قسم کی امداد کرنے کی اپنے طور پر کوشش تو کرتے ہی۔ ان کی سیر و تفریح کا انتظام کرتے۔ کبھی ان کو باجماعت آگرے کا تاج محل دکھاتے کبھی دلّی کا قطب مینار۔ کبھی "لو من کی دھوبن"۔ غرض جتنے دن یہ شغلہ رہتا خالد بھائی اپنی دکان اور اپنے دوستوں سے بے نیاز رہتے۔ خالد بھائی بازار میں جب بھی رہتے اپنی دکان میں کم، چائے خانے میں زیادہ نظر آتے۔ صبح سے شام تک ان کے نام کے نعرے لگتے۔

ایک دن سننے میں آیا کہ خالد بھائی نے سارے دھندے ختم کر دیے اور داڑھی چھوڑ دی۔ مولانا ہو گئے۔ ان کا زیادہ وقت نماز روزے میں گزرتا۔ پھر ایک روز سنا کہ بیمار ہو گئے۔ بری حالت ہو گئی۔ اسپتال میں داخل کر دیے گئے۔ جب وہاں سے نکلے تو صورت پہچانی نہ جاتی تھی۔ بالآخر ایک روز یونیورسٹی کے رجسٹرار آفس میں نظر آئے۔ اب برسوں سے کلرکی کر رہے ہیں۔ سر جھکا کر چلتے اور لڑکوں کی بدعنوانیوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے ہیں۔ انھیں یہ شکایت ہے کہ "کیا زمانہ آ گیا ہے کہ بدمعاشی کے آداب بھی ختم ہو گئے ہیں۔ یہ لڑکے چیخ چیخ کر گالیاں دیتے ہیں۔ کہ بدر باغ تک سنائی دیتی ہیں۔ ماں بہنوں کی رعایت تک نہیں کرتے۔"

خالد بھائی فخریہ کہتے ہیں۔ بدمعاشی ہم نے بھی کی لیکن اگر اپنے استاد کو دیکھ لیتے تھے تو شرم سے سر جھک جاتا تھا۔ اور نظر جھکا کر ادھر ادھر سرک جاتے تھے۔ اور اب کے بدمعاشوں کا یہ حال ہے کہ استادوں اور

بزرگوں کا احترام باقی نہیں رہا۔ سر اٹھا کر ڈاکٹر صاحب، سلام وعلیکم، کہتے ہوئے گزرتے ہیں۔ ہم نے کبھی دادا گیری نہیں کی۔ لیکن اپنے سے چھوٹوں کے سامنے کبھی ہلکی پھلکی بات نہیں کرتے تھے۔ ہمیں اپنی کجی کا احساس تھا۔"

یہ ہے خالد بھائی کا غم ـــ اب بھی وہ روزانہ دن میں کسی نہ کسی بہانے شمشاد میں ایک بار ضرور آتے ہیں۔ اور چپکے سے اپنے شمشاد کو دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔ ان کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر ہوتی ہے کہ لوگ انھیں پہچانتے نہیں۔ میرا خیال ہے کہ شمشاد کا تسلسل کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک دریا کی طرح بہتا رہتا ہے۔ وقت بھی اسے ماضی سے حال کو اور حال سے مستقبل کو علاحدہ نہیں کر سکتا۔ خالد بھائی کے جاننے پہچاننے والے آج بھی شمشاد میں موجود ہیں۔ لیکن وہ خالد بھائی کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتے۔ اور خالد بھائی بہادر کے یہاں سے یا گنجل کی دکان کے پاس والی پان کی دکان سے پان کھا کر چپ چاپ رجسٹرار آفس کی طرف چلے جاتے ہیں۔

اسد یار خاں کے گھر کے نیچے دادا ڈرائی کلینرز کی دکان ہے، راماد سنگھن کی دکان اور شہ راجی کی فوٹو گرافی کی دکان ہے۔ دادا ڈرائی کلینرز کی دکان پر یاد آیا۔ شاید دس بارہ سال ہو گئے۔ ساحر لدھیانوی اور پرکاش پنڈت آئے تھے۔ ساحر اپنے سوٹ کو گھڑی بھر کی چوتھائی میں ڈرائی کلین کرانا چاہتے تھے چنانچہ دادا کی دکان پر گئے۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ پھر ساحر لدھیانوی کا نام سن کر انھوں نے دماغ پر زور ڈالا۔ غالباً ذرا [illegible] پر سوچ بچار کیا اور بالآخر اس فریضے کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ ساحر کو بہت مایوسی ہوئی۔

یہ سچ ہے کہ شمشاد میں آپ چاہیں تو کھڑے کھڑے عطاء اللہ کی دکان سے ایک کتاب کی جلد بندھوالیں۔ پندرہ منٹ میں کھانا پکوالیں۔ پندرہ منٹ میں بال بنوالیں۔ بیٹھے بیٹھے مولانا عشرت سے جوتا تیار کروالیں۔

لیکن کھڑے کھڑے کپڑے ڈرائی کلین نہیں ہو سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شمشاد ماڈرن لائف کی علامت نہیں ہے۔ ماڈرن لائف میں جہاں کتابوں کی جلد آپ کی آنکھوں کے سامنے نہیں بندھ سکتی۔ پندرہ منٹ میں کھانا تیار نہیں ہو سکتا۔ آپ کو مینو کے مطابق اپنی بھوک کو ڈھالنا ہے۔ شمشاد میں ڈرائی کلیننگ کھڑے کھڑے اسی لیے نہیں ہو سکتی کہ یہ ماڈرن لائف کی علامت ہے۔

علی گڑھ کا نوجوان کتنا ہی جدید ہو لیکن وہ روایت پرست ہوتا ہے۔ اگر اس کے سامنے ایک طرف لیلارام کی شاندار دکان ہو اور دوسری طرف جبار کی بے درو دیوار کی دکان تو مجھے یقین ہے کہ علی گڑھ والا سوٹ پہن کر جبار کی دکان میں باہر کھڑے کھڑے سودا لے گا۔ اسی لیے مجھے ۱۹۴۱ء کے شمشاد اور ۱۹۷۶ء کے شمشاد میں کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آتا ہے۔ لڑکے بدل گئے ہیں ان کے لباس بدل گئے ہیں۔ ان کے دماغ بدل گئے ہیں۔ لیکن ان کا دل وہی ہے۔ اس میں رتی بھر تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہی مومن کا مومن ہے۔ علی گڑھ کا لڑکا ایک معمولی سی اکیٹی ڈیمی کے لیے گھنٹوں کی قربانی دے سکتا ہے۔ وہ چاہے کتنا ہی ماڈرن کیوں نہ ہو۔ لیکن معید خاں کو دیکھ کر یہی کہتا ہے "نہیں ہے کوئی طاقت سوائے اللہ تعالیٰ کے"

معید خاں سے علی گڑھ میں کون واقف نہیں۔ وہ علی گڑھ کے آثار قدیمہ ہیں۔ کتنی نسلیں ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئی ہیں۔ جیسے سنیما کے پردے پر مناظر گزرتے ہیں۔ معید خاں گورے چٹے رنگ اور اپنے پٹھانی تیور کے ساتھ اس بڑھاپے میں بھی پہچانے جاتے ہیں۔ ڈیوٹی سوسائٹی کے دفتر کے کارکن ہی نہیں بلکہ خود ڈیوٹی سوسائٹی ہیں۔ ان کے ذہن میں ڈیوٹی سوسائٹی کا سارا ریکارڈ ہے۔ ان کی یادداشت غضب

کی ہے۔ ممکن ہے کہ ایسی یادداشت کے لوگ ہمارے ملک میں اور بھی ہوں۔ اگر کوئی طالب علم ان سے سن ۱۹۳۰ء میں ملا تھا محض ایک بار۔ تو انھیں آج تک اس کا شجرہ یاد ہے بھلے ہی وہ طالب علم اپنا شجرہ بھول گیا ہو۔ اپنے بزرگوں کے نام اسے صحیح یاد نہ ہوں۔ معید خاں کو تاریخ اسلام کے ہر گوشے سے مکمل طور پر واقفیت ہے۔ ٹہلنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ لیکن یہ ٹہل وہ پیدل نہیں کرتے۔ سائیکل پر کرتے ہیں۔ اب تو خیر بہت کم نظر آتے ہیں۔ شاید ضعیفی اس کی اجازت نہیں دیتی۔ یا پھر علی گڑھ سے انھیں ویسی ہی شکایت ہو جیسی پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کو ہے۔ پچھلے سال میاں نے رشید صاحب سے شکایت کی کہ آپ بالکل ہی کہیں نہیں آتے۔ "فلاور شو" میں آپ کے پھولوں کے ساتھ آپ کا نام سننے کو ملتا ہے۔ لیکن وہاں آپ پھر بھی نظر نہیں آتے۔ بہت سے لوگ اس نمائش میں محض اس لیے جاتے ہیں کہ شاید آپ کا نیاز حاصل ہو جائے۔"

رشید صاحب مسکرائے اور بولے "میاں اب تو بالکل ہی باہر نہیں نکل سکتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک روز یوں ہی اپنے علی گڑھ کو دیکھنے کو جی چاہا تو نکل کھڑا ہوا۔ ہر طرف کھلے کھلے بالوں والی لڑکیاں نظر آئیں۔ شوخ رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے مگر دوپٹہ کسی کے سر پر نہ تھا۔ مجھے ذرا عجیب سا لگا۔ کیونکہ میں نے اس سے پہلے یہ صورت حال نہ دیکھی تھی۔ لیکن یہ معلوم ہو کر حیرت ہوئی کہ لڑکیاں نہیں لڑکے ہیں۔ میں واپس آ گیا۔ اور اب محض اس لیے گھر سے نہیں نکلتا کہ میری آنکھوں میں علی گڑھ کی جو تصویر ہے وہ آخر دم تک قائم رہے تو اچھا ہے۔"

شاید معید خاں بھی اس تصویر کو بگاڑنا نہیں چاہتے۔ اس لیے آجکل وہ بھی شاید ہی کہیں نظر آتے ہیں۔

لیکن علی گڑھ والے ان کو نہیں بھولتے۔ کسی علی گڑھ والے نے کہیں کہہ دیا کہ معید خاں سے ملاقات ہو جائے تو امتحان کا پرچہ خراب ہو جاتا ہے۔ اب یہ بات چل پڑی۔ اب بھلا بتائیے کہ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ پڑھیں لکھیں تو خود نہیں الزام دوسرے کے سر پر۔

ذاکر صاحب ایک روز سنا رہے تھے کہ ایک بار چند لڑکے ان کے پاس ایک وفد کی صورت میں پہنچے اور کہنے لگے کہ "آپ یونیورسٹی کے سربراہ ہیں حکم دے دیجیے کہ امتحان کے زمانے میں معید خاں ۸ بجے سے پہلے گھر سے ٹہلنے نہ نکلیں، جب تک لڑکے امتحان کے کمرے میں نہ پہنچ جائیں۔"

ذاکر صاحب نے بہت سمجھایا توہم پرستی کے خلاف مدلل تقریر کی لیکن لڑکے نہیں مانے۔ بالآخر ذاکر صاحب نے ان کو ڈانٹا۔ اور کہا "میں یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوں۔ کوتوال شہر نہیں ہوں۔ اور یہ کام کوتوال بھی نہیں کر سکتا کہ سارے شہر میں صرف ایک آدمی کے لیے کرفیو آرڈر نافذ کر دے۔"

لڑکے بددل ہو کر وائس چانسلر کی کوٹھی سے نکلے اور پھر یہی سوچ لیا کہ ان کو دیکھ کر وحدہٗ لاشریک کو یاد کریں گے۔ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ قہر درویش بر جان درویش۔

بہت دنوں کی بات ہے کہ میں رجسٹرار آفس میں جمال الرحمٰن صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یہ زمانہ تھا شاید محمود صاحب یا علیم صاحب کی رجسٹراری کا۔ معید خاں بھی وہیں آ گئے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ نتیجے نکلنے شروع ہو گئے تھے۔ کچھ نتیجے نکل چکے تھے۔ اتنے میں دو لڑکے کمرے میں داخل ہوئے۔ باہر ذرا عجب سے آ رہے تھے کمرے میں انھیں ٹھیک سے دکھائی نہیں دیا۔ جمال صاحب نے

مخاطب ہوئے: "سنا ہے آج نتیجہ نکل گیا ہمارا۔ رزلٹ بھی بتا دیجیے۔"
جمال صاحب نے نتیجے کی کاپی اٹھائی۔ اب ان کی نظر ہم لوگوں پر پڑی تو پلٹ گئے۔ جیسے بھولے سے کسی غلط کمرے میں داخل ہوئے معید خاں ان کی طرف لپکے اور انھیں کشاں کشاں کمرے میں لائے اور بولے کہ "آپ مجھے منحوس سمجھ رہے ہیں۔ شرم نہیں آتی دیکھیے اپنا نتیجہ۔ وہ لڑکے پہلے تو دیر تک انکار کرتے رہے کہ وہ نتیجے کے لیے آئے ہی نہیں تھے۔ ہم نے بھی معید خاں کی ہاں میں ہاں ملائی اور بالآخر لڑکوں کو نتیجہ دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن یقین مانیے کہ ان کے نتیجے کا اشتیاق جتنا ان لڑکوں کو تھا اس سے زیادہ مجھے اور مجھ سے زیادہ معید خاں کو۔

الغرض نتیجہ دیکھا گیا۔ ہم سب کے سر جھک گئے۔ لڑکے بھی اس طرح کمرے سے نکلے، جیسے انھوں نے کوئی جرم کیا ہو۔ اور سچ ہے جرم ہی تو ہے نہ پڑھنا بھی اور اچھے نتیجے کی توقع کرنا۔ تضیع اوقات تو خود کریں اور لعنت دوسروں پر بھیجیں۔

معید خاں دراصل ایک فرد کا نہیں، ایک مخصوص تہذیب کا نام ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج کے علی گڑھ کے بہت سے لڑکوں نے انھیں شاید دیکھا بھی نہ ہو۔ لیکن نام سے ہر ایک واقف ہے۔

اور یہ سعادت زور بازو سے حاصل نہیں ہوتی۔ ورنہ بازو میں تو بہتوں کے زور ہے۔ اور شاید بہت زیادہ زور۔

توہم پرستی کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ فیض گیٹ سے نکل کر اسٹیشن کی طرف چلیے تو راستے میں تالاب ملتا ہے جسے علی گڑھ میں نہ جانے کیوں لال ڈگی کہتے ہیں۔ آپ لال ڈگی کی موڑ پہ گرلز کالج کی طرف چل پڑیے ... محل سے نکل کر جب آپ آگے

بڑھیں گے تو آپ کو داہنی طرف ایک ویران سی کوٹھی نظر آئے گی۔ اسے "دلکشا" کہتے ہیں۔ خدا جانے یہ بات کیسے مشہور ہو گئی کہ اس کوٹھی میں جن بھوت رہتے ہیں چنانچہ کوئی شخص یہ مکان لینے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ ایک بار چند سرپھرے لڑکوں نے طے کر لیا کہ اس میں رہا جائے۔ چنانچہ پانچ روپے ماہانہ کرایہ پر کوٹھی لے لی گئی۔ دس بارہ لڑکے تھے کوٹھی میں دن بھر ہنگامہ رہتا تھا۔ آدھی رات تک چائے بنتی اور پڑھائی کا موڈ بنانے کی تیاریاں ہوتیں۔ ویسے عام طور پر پڑھائی کا موڈ نہ بنتا۔ روز نئی نئی تفریحیں سوجھتیں۔

ایک روز عبدالحلیم کے دماغ میں ایک نئی شرارت سوجھی۔ یہ حلیم صاحب آجکل بجنور میں وکالت کرتے ہیں۔ اور مولوی عبداللطیف بجنوری کے بھتیجے ہیں۔ ایک جھلنگا چارپائی وہاں کھڑی تھی انھوں نے اس کے بان کاٹ کر صاف کیے اور ڈرائنگ روم میں رکھ کر ایک خوبصورت شیر کوٹ پلنگ پوش بچھا دیا۔ اور پاس ہی حقہ تازہ کر کے چلم بھروا کر رکھ دی۔ یہ وقت وہ تھا کہ سب لوگ ایک ایک کر کے کلاس سے آیا کرتے تھے۔ اب جو مسعود النبی داخل ہوئے، پلنگ بچھا ہوا حقہ بھرا ہوا دیکھا تو اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ انھوں نے حقے کی نے منہ میں لی۔ اور پلنگ پر بیٹھے۔ پلنگ پر بیٹھنا تھا کہ دھڑام سے نیچے آ گئے۔ لیکن الکدم بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھے اور نوکر کو آواز دی اور حلیم میاں اور مسعود النبی نے جلدی جلدی دوسری چلم بھری۔ اور پلنگ پوش کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ اب جو آتا اسی عمل سے گزرتا اور اگلے کے گرنے کا انتظام کرتا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلا جب تک کہ آخری طالب علم نہیں آ گیا۔

الغرض ان ہنگاموں کی بدولت "دلکشا" کی شہرت ہو گئی۔ اگر کوئی بھوت وہاں ہوتا تو یقیناً بھاگ چکا ہوتا۔ مالک مکان کو اپنی حماقت پر افسوس ہوا۔ اور اس نے مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دیا۔ معاملہ پرووانس یا انسلر

کے پاس پہنچا۔ پروفیسر ابوبکر احمد حلیم۔۔۔ جنھیں لڑکے "آبا" حلیم کہتے تھے۔ کیونکہ ان کے نام کے ابتدائی حروف سے اے۔بی۔اے۔ایچ (A B A H) بنتا تھا۔

حلیم صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تبلر تھے۔ ان کی زبان سے نکلا ہوا لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے اتنے چھوٹے سے قد کے کسی آدمی کی شخصیت اتنی بارعب نہیں دیکھی۔ حلیم صاحب کے سامنے لڑکے کانپتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی ڈسپلن کا تین چوتھائی سبب حلیم صاحب تھے۔ حلیم صاحب کی کچھ کمزوریاں ایسی تھیں جن کی وجہ سے ان کی مقبولیت میں ہمیشہ فرق آیا۔ ان کی بعض کمزوریوں نے تو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ لیکن اب جبکہ میری عمر پچاس سال سے تجاوز کر گئی ہے میں سوچتا ہوں کہ حلیم صاحب بلا وجہ بدنام تھے۔ نظیر نے تو ڈیڑھ سو سال پہلے لکھ دیا تھا کہ "سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے۔" پھر بیچارے حلیم صاحب سے ہی شکایت کیوں۔ وہ تو انسان تھے۔ علی گڑھ والے اعتدال پسند کبھی نہیں ہوسکتے۔ انھوں نے جو کام کیا اس کو آخری حد تک پہنچا دیا۔ اب یہی خوشامد کو فن بنانا علی گڑھ والوں کا حصہ ہے۔ اور اس فن میں اتنا کمال کر دکھایا کہ اچھے اچھے آدمی عش عش کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنے پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے۔ خوشامد کے نام سے دور بھاگتے تھے۔ علی گڑھ والوں نے تو ان کو بھی زیر کر لیا۔ بقول ہمارے ایک دوست کے (نام نہیں لوں گا اس لیے وہ گھبرائیں نہیں) "خوشامد ہر ایک پسند کرتا ہے بس خوشامد کرنے والوں کا کام تو یہ ہے کہ وہ صرف اپنے ممدوح کی کمزوری کا پتا چلالے۔ اور کمزوری کس میں نہیں ہوتی۔ یونیورسٹی میں جو آدمی استاد ہو سکتا ہے۔ اس کے کم از کم اتنی عقل تو ہوتی ہی ہے کہ اتنی معمولی بات دریافت کرلے!" چنانچہ "آبا" حلیم کا واقعہ ہے کہ ایک روز وہ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خوشامدیوں کا دربار لگا ہوا تھا چند لوگ

واضح طور پر خوشامد بھی کر رہے تھے۔ لیکن جو اس کے مبتدی تھے اور محض سیکھنے کی خاطر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ صرف تائید کر رہے تھے۔ اچانک حلیم صاحب کو اس واضح خوشامد سے کچھ گھٹن ہونے لگی۔ اور ایک بار وہ ذرا آواز اٹھا کر بولے۔ "دیکھیے صاحب میں ایک بات آپ لوگوں کو بتا دوں میں خوشامد پسند نہیں کرتا۔ بلکہ برداشت بھی نہیں کر سکتا اور جو صاحب خوشامدی ہوں وہ سر ضیاء الدین احمد کے پاس جائیں۔"

یہ جملہ حلیم صاحب نے جس تیکھے انداز میں کہا تھا وہ جلتی آگ کو بھی بجھا سکتا تھا۔ لیکن دربار میں بیٹھنے والے کچی گولیاں نہیں کھیلے۔ ان میں ایک استاد بھی تھے جو اس فن کے کامل تھے کہنے لگے "حضور ہمیں آپ کی یہی بات تو پسند ہے کہ آپ خوشامد پسند نہیں کرتے۔ اور اسی لیے دو گھڑی کو آپ کے پاس آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ خوشامد اپنا شیوہ نہیں۔ ورنہ سر ضیاء الدین کیا برے تھے۔"

یہ جملہ سن کر حلیم صاحب پھولے نہ سمائے اور انھوں نے اپنی خوشامد پسند نہ کرنے کی عادت کی تمام حاضرین سے تائید کروائی۔ حلیم صاحب مر گئے ہمیں بھی مرنا ہے لیکن یہ فن علی گڑھ میں بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اب تو حلیم صاحب کے سامنے خوشامد کرنے والے بھی آج کے بعض اساتذہ کے سامنے پڑھانا چھوڑ دیتے اور بہشتی کا کام کرنا پسند کرتے۔ انھوں نے ذاکر صاحب سے لے کر خسرو صاحب تک کو نہیں بخشا۔

علی گڑھ میں مکھن بہت بنتا ہے۔ کہیں اچھا اور کہیں خراب اور سب استعمال ہوتا ہے۔ کوئی سنٹر ڈیری فارم کا مکھن استعمال کرتا ہے، تو کوئی چیمپین ڈیری فارم کا سب کی کھپت ہے اور سرا ایک کے یہاں چل جاتا ہے۔ اس میں مکھن کا کمال نہیں ہے، توس پر لگانے والے کا کمال ہے کہ وہ ایک توس میں کتنا مکھن کھپا دیتا ہے۔ اس لیے مکھن خوشامد کی چیمپین کا ہونا

پولسن کا ___ برابر ہے بس۔ وقت پر جو بھی مل جائے۔

علی گڑھ کے ایک اہم پرو وائس چانسلر کا ذکر آیا تو لگے ہاتھوں کچھ وائس چانسلروں کا بھی ذکر ہو جائے۔ میں نے علی گڑھ میں ۱۹۵۶ء سے آج تک۔ چھے وائس چانسلروں کا زمانہ دیکھا ہے۔ اور ان میں سے بعض سے سابقہ بھی پڑا ہے۔ اس کے علاوہ دو وائس چانسلر قائم مقام تھے اور عارضی طور پر رہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی اور پروفیسر ہربنس لال شرما ___ ان کو بھی اگر شامل کر لیا جائے تو آٹھ ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر ہربنس لال شرما کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ وہ پہلے ہندو تھے جو شاید عارضی طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ گویا میں بلا تشبیہہ اس یونیورسٹی کا امیر خسرو ہوا۔ فرق یہ ہے کہ وہ بہت بڑے تھے۔ بہت بڑے۔ ہر اعتبار سے بڑے۔ وہ ولی اللہ تھے کوئی بادشاہ ان سے خوش ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس میں ان کی بزرگی کو بھی دخل ہے اور شعر و شاعری کو بھی کہ اللہ سے لے کر ظل الٰہی تک۔ ان کی رسائی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر شخص کے درمیان یکساں طور پر مقبول تھے۔ میں ادنیٰ درجے کا آدمی۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ اٹھارہ پہلے جس منصب پر تھا خدا نے ابھی تک اسی پر قائم رکھا ہے اور میں اسی کو بڑی بات سمجھتا ہوں۔

ہاں تو وائس چانسلروں کی بات ہو رہی تھی۔ میں سوچتا ہوں کہ علی گڑھ کی بات ہو اور وائس چانسلر کا ذکر نہ آئے تو بات کچھ عجیب سی ہو گی علی گڑھ میں وائس چانسلر اصل چیز ہوتا ہے۔ پروفیسر خورشید الاسلام اپنے تقرر کا ایک واقعہ سناتے ہیں جس کو شاید تیس سال سے زاید ہو گئے ہیں کہتے ہیں کہ ان کے لکچرر کی سلکشن کمیٹی ہوئی تو ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد نے ان کو اپنی کوٹھی پر بلایا اور جہاں اور باتیں کیں وہاں ایک نصیحت بھی کی: "ہم نے تمھاری لیاقت دیکھ کر تمھارا تقرر کر دیا ہے، اب محنت سے اپنا کام کرو اپنی تقریر کے

فنڈ سے یونیورسٹی کے فنڈ کو فائدہ پہنچاؤ۔ لیکن یاد رکھنا علی گڑھ میں رہنا ہے تو دو کے
خلاف کبھی کچھ مت کہنا۔ ایک تو اللہ میاں کے خلاف، دوسرے وائس چانسلر کے
خلاف۔ سمجھے وائس چانسلر کے۔" انھوں نے وائس چانسلر پر اتنا زور دیا کہ بیچارے
اللہ میاں پس پشت رہ گئے۔ اور سچی بات بھی ہے ہم لوگ اردو میں میاں جس کے
نام کے ساتھ لگاتے ہیں اس کو محض سیدھا سادا ہی سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ میاں
کس سے بدلہ لیں گے۔ ویسے بھی وہ رحیم و کریم ہیں اور وائس چانسلر نہ رحیم ہوتا ہے
اور نہ کریم۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین اس وقت یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے جب
مسلم لیگ عروج پر تھی۔ شاید اسی وجہ سے وہ طلبہ میں مقبول نہ تھے کیونکہ طالب علم
بھی اس بات سے واقف ہو چکے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کی سیاست کیا ہے اور وہ
کس کے ساتھ ہیں۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ وہ لڑکوں کو اپنے ہاتھ میں لے
لیں لیکن انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے
طالب علموں کے اس حلقے کو اپنے ہاتھ میں لیا، جن سے یونیورسٹی کے اچھے لڑکے
ڈرتے تھے۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین نے کبھی پولیس کی ملازمت نہیں کی تھی، لیکن ان
کو انتظامیہ کا یہ راز معلوم ہو گیا تھا کہ ایک چھوٹے گروہ کی مدد سے بڑی جماعت
پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ایسے لڑکوں کو ضرورت سے زیادہ رعایتیں فراہم
کر دیں اور کسی نہ کسی طرح اپنا کام چلاتے رہے۔ لیکن ایک دن یہی ہوا کہ ان ہی لڑکوں
نے ڈرا دھمکا کر ڈاکٹر صاحب سے استعفیٰ لے لیا۔ اس میں یونیورسٹی کے دوسرے
لڑکے بھی شامل ہو گئے۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے مایوس ہو کر انگلستان کا رخ کیا۔
وہاں ان کا انتقال ہوا۔ جب ان کی لاش علی گڑھ لائی گئی تو یونیورسٹی ہی کے لڑکوں
نے ان کو یونیورسٹی کی مسجد میں سر سید کے پہلو میں دفن کروا دیا۔ کچھ تو اس لیے بھی
کہ انسان کی یادداشت کمزور ہوتی ہے اور کچھ اس لیے بھی کہ ڈاکٹر ضیاء الدین
کے زمانے کے طالب علم یونیورسٹی چھوڑ چکے تھے اور نئے طالب علموں نے صرف

ان کی خوبیاں سنی تھیں۔ کمزوریاں تو ان کے سامنے دفن ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب غیر معمولی صلاحیت کے آدمی تھے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے بڑی صحیح بات کہی ہے۔

"ڈاکٹر صاحب کو فطرت نے بڑی صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ انھوں نے ان سے کوئی بڑا کام نہ لیا اور ان کو پارٹی بازی اور ہنگامی مصروفیات میں برباد کر دیا۔ ان کے اندر اتنی اعصابی قوت تھی کہ اگر وہ چاہتے تو گنگا کے بہاؤ کو موڑ دیتے مگر انھوں نے تاریخ کے بہاؤ کو بھی نظر انداز کر دیا۔ ان کی جفاکشی مستقل مزاجی دوڑ دھوپ کی شاید ہی کوئی دوسری مثال مل سکے۔ انھوں نے ایک نہایت مصروف زندگی گزاری مگر اس مصروفیت سے کوئی دیرپا کام نہ لیا۔ ان میں غرور بالکل نہ تھا۔ وہ اپنی غرض کے لیے ہر سطح پر اتر آتے تھے اور اپنے دشمن کو رام کرنے کے لیے کوئی دقیقہ نہ چھوڑتے۔ انھوں نے بڑا رسا اور تیز ذہن پایا تھا مگر ان کی ساری ذہانت داؤ پیچ، گروہ بندی، انتخاب اور ستی کامیابی کی نذر ہو گئی۔"

یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کا حافظہ بڑا غضب کا تھا لیکن جس بات کو یاد نہ رکھنا چاہتے تھے اسے بھول جاتے تھے۔ ان کے بھولنے کے بارے میں طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب سے بارہا ملا۔ لیکن وہ مجھے کبھی نہ پہچانتے تھے۔ البتہ جب کبھی میں اپنے محسن ڈاکٹر عبادالرحمن خاں کے ساتھ ملا تو انھوں نے نام لے کر مجھ سے بات کی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اس وقت وہ مجھ سے مخاطب نہیں ہیں ڈاکٹر آئی آر خاں سے مخاطب ہیں۔

ڈاکٹر صاحب بڑے برے وقت میں وائس چانسلر ہوئے تھے۔ ملک میں آزادی کے بعد ایک طوفان آیا ہوا تھا کوئی کہہ سکتا تھا کہ اس ریلے میں یونیورسٹی نہ بہہ جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے چاروں ہاتھ پاؤں سے ناؤ چلائی اور اس طوفان کا مقابلہ کیا اور ناؤ کنارے پر لگا دی۔ ان کا یہ معمولی کارنامہ نہ تھا کہ انھوں نے یونیورسٹی کو بچا لیا۔ نہ صرف بچا لیا بلکہ اسے وقار بھی دیا اور سرسید کی روایات کو بھی آگے بڑھایا۔

ذاکر صاحب جمہوریت کے قائل تھے، استادوں کی عزت کرتے تھے شاید اسی لیے ان کے زمانے میں سیاست داں استادوں نے پاؤں نکالے۔ ذاکر صاحب کو اس سے پہلے جامعہ کے استادوں سے سابقہ پڑا تھا۔ علی گڑھ کے پروفیسر جامعہ کے استاد نہ تھے انھوں نے بالآخر ایسی صورت پیدا کر دی کہ ذاکر صاحب کو میدان چھوڑنا پڑا۔

ذاکر صاحب نے قبل از وقت استعفیٰ دے دیا تھا۔ ان کے بعد کرنل بشیر حسین زیدی آئے وہ بڑا اچھا ذہن رکھتے تھے اور یونیورسٹی میں بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ بغیر روپے کے ترقی نہیں ہوتی۔ چنانچہ انھوں نے اسکیموں اور روپے کا ڈھیر لگا دیا۔ جو کام ان کے زمانے میں مکمل نہ ہو سکے، اس میں ان کا قصور نہ تھا کیونکہ عمل درآمد کرنا دوسروں کا کام تھا۔ وہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے اسکیم روپیوں کے ساتھ منظور کرا کے لاتے تھے۔ ان کے زمانے میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیرمین تھے سی۔ڈی۔ دلیش مکھ۔ دلیش مکھ صاحب کنیڈی ہاؤس کا سنگ بنیاد رکھنے آئے تو انھوں نے اپنی تقریر میں کہا "جب میں آپ کے وائس چانسلر کی کار اپنے دہلی کے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں تو اپنے سکریٹری کو ہدایت کرتا ہوں کہ دیکھو جب میں تمھیں زیدی صاحب کے سامنے بلاؤں اور پوچھوں تو یہی کہنا کہ ہمارے پاس کوئی فنڈ نہیں ہے چنانچہ جب زیدی صاحب میرے کمرے میں آتے تو میں ان سے یہی کہہ دیتا، بھائی ہمارے پاس روپیا تو ہے نہیں۔ اس لیے آپ روپے کی بات مت کیجیے گا۔"

زیدی صاحب کہتے "دلیش مکھ صاحب میں آپ سے روپے کی بات کرنے نہیں آیا۔ میں تو چاہتا ہوں، ہماری یونیورسٹی میں کچھ اچھے کام ہونے چاہییں۔" اور ذرا سی دیر میں وہ اپنے بریف کیس سے فائل نکالتے اور چند اسکیمیں دکھاتے محض دکھانے کے لیے جو بہت اعلیٰ درجے کی ہوتیں لیکن وہ اسے بند کر دیتے اور بریف کیس میں رکھتے ہوئے کہتے پھر جب کبھی روپیا ہوگا

تو ان پر غور کریں گے۔"

ولیش مکھ صاحب نے اپنی تقریر میں بہت زور دے کر کہا "میں ان اسکیموں کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتا اور ان سے کہتا، زیدی صاحب ان پر تو فوراً عمل درآمد ہونا چاہیے۔ یہ تو بہت اچھے کام ہیں، آپ کی یونیورسٹی سے پہل ہو گی تو دوسری یونیورسٹی والے بھی پیروی کریں گے۔ جہاں تک روپے کا معاملہ ہے اس کا انتظام میں کیے دیتا ہوں۔ چنانچہ میں اپنے سکریٹری کو بلاتا ہوں اور وہ بیچارا میرا کہا ہوا جملہ دہرا دیتا ہے۔ میں جھنجھلا جاتا اس سے کہتا بجٹ لاؤ اور پھر کہیں نہ کہیں سے کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی دیتا۔ اور زیدی صاحب جب یونیورسٹی گرانٹس کے دفتر سے نکلتے تو کئی لاکھ روپے لے کر چلے جاتے اور ان کے جانے کے بعد میں اور سکریٹری سر پر ہاتھ دھرے تھوڑی دیر بیٹھے رہتے کہ لے گئے روپیا۔۔۔ تو یہ ہیں آپ کے زیدی صاحب۔"

زیدی صاحب کا زمانہ بہت اچھا گزر رہا تھا لیکن اس زمانے میں سرور صاحب ان کے مشیر تھے انھوں نے رائے دی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کو پرو وائس چانسلر کے طور پر حیدر آباد سے بلالیا جائے اور اس طرح ڈاکٹر یوسف حسین خاں یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ہو گئے۔ یوسف صاحب بڑے با صلاحیت آدمی ہیں ان کو کسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونا چاہیے تھا۔ پرو وائس چانسلر کی کرسی ان کے لیے چھوٹی ہو گئی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لیے ایک نیا منصب تراشا۔ انھوں نے یونیورسٹی میں زیادہ تر "انیٹی وائس چانسلر شپ" کی۔ جس کی وجہ سے زیدی صاحب کا آخری زمانہ اچھا نہیں گزرا۔ لیکن انھوں نے میڈیکل کالج کی بنیاد ڈال دی۔ اسی زمانے میں کلچرل کمیٹی کا واقعہ پیش آیا۔ ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نے مولیر کا ایک مشہور ڈراما "تارتوف" تیار کیا۔ یہ ڈراما بین اقوامی شہرت رکھتا ہے۔ جس میں ایک نام نہاد دیندار کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ عین وقت پر کسی کو سوجھ گئی کہ اس

کے خلاف ایجی ٹیشن کرا دیا جائے تو زیدی صاحب استعفیٰ دے سکتے ہیں۔ چنانچہ طلبہ نے ایجی ٹیشن کر دیا۔ پروفیسر آل احمد سرور کلچرل کمیٹی کے صدر تھے اور پروفیسر خورشید الاسلام سکریٹری۔ راقم الحروف بھی اس وقت کلچرل کمیٹی کا ممبر تھا۔ اس ایجی ٹیشن کا اثر یہ ہوا کہ وہ ڈرا ما بنگلور میں انٹر یونیورسٹی یوتھ فیسٹول میں جا سکا۔ میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا، ناگفتہ کو غنیمت سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس کی تفصیلات متعلقین کو زبانی یاد ہیں۔ البتہ یہ جانتا ہوں کہ علی گڑھ کے لڑکے بُرے نہیں، نادان ضرور ہیں اور اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ حالانکہ سرکاری کھاتے میں، ان ہی کا نام لکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کون ایسا بے حیا ہوگا جو زنان خانے میں بے دھڑک داخل ہو جائے گا۔ جہاں صاف لکھا ہے کہ "یہاں پردہ ہے۔"

زیدی صاحب کے بعد جناب بدرالدین طیب جی وائس چانسلر ہوئے۔ بڑے خاندانی آدمی تھے۔ رعب داب کے تھے۔ چند روز کے اندر ان کو یہ راز نہ جانے کس نے بتا دیا کہ لڑکوں کو خوش رکھو کوئی مسئلہ نہیں کھڑا ہوگا۔ طیب جی وقت کے پابند تھے۔ لڑکے ان کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کرنے لگے۔ انھوں نے لڑکوں کو خوب ہی خوش کیا اگر اس کے لیے کسی استاد کی قربانی بھی دینی پڑی تو انھوں نے اسے "نمکین عید" سمجھ کر گوارا کر لیا۔ انھوں نے یونیورسٹی کے ڈسپلن میں بہت دلچسپی لی۔ کاموں میں بہت باقاعدگی آگئی۔ لیکن پھر ان کو گورنمنٹ آف انڈیا میں ایک اچھی ترقی ملی۔ وہ سول سروس کے آدمی تھے۔ ان کو کیریئر زیادہ عزیز تھا۔ چنانچہ جاپان سفیر ہو کر چلے گئے۔ علی گڑھ والے یہ دیکھتے رہ گئے کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے لیکن کروٹ لینے سے پہلے ہی وہ تو اٹھ کھڑا ہوا۔ بدرالدین طیب جی کی جگہ نواب علی یاور جنگ آئے۔ انھیں خاصہ خمیازہ بھگتنا پڑا۔ وہ علی گڑھ سے واقف نہ تھے۔ اور شاید ان کو کسی نے یہ نہ بتایا تھا کہ پچھلے دو ایک سال میں لڑکوں کی تربیت کیسی ہوئی ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ انجنیرنگ کالج میں پچھتر فی صد علی گڑھ کے طالب علم لیے جاتے تھے۔

اور پچیس فی صد باہر کے۔ یہ معاملہ علی یاور جنگ کے آنے سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا کہ یہ تعداد برابر کر دی جائے۔ غالباً علی یاور جنگ کو اس پر عمل درآمد کرنا تھا۔ یہاں سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ علی یاور جنگ بے قصور تھے۔ ان کی نیت اچھی تھی۔ اور وہ علی گڑھ کی صحیح معنوں میں خدمت کرنا چاہتے تھے۔ اگر وہ رہ جاتے تو علی گڑھ کو بہت فائدہ پہنچتا خاص طور پر علی گڑھ کے قرب وجوار کے مسلمان بچوں کو۔ جو دوسرے ڈگری کالجوں سے پڑھ کر علی گڑھ میں انجینئرنگ کالج میں داخلہ لینا چاہتے تھے۔ لیکن اس کو چھوڑ دیجئے۔ یہ وقت تفصیل میں جانے کا نہیں ہے۔ مجھے جو واقعہ چشم دید نواب رحمت اللہ خاں شیروانی نے بتایا ہے وہ بہتوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ اگر کوئی تفصیل جاننا چاہے تو مجھے یقین ہے کہ نواب صاحب سے سچی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

بہر حال علی یاور جنگ چلے گئے قرعہ پروفیسر عبدالعلیم صاحب کے نام پڑا۔ ان کے زمانے میں جو کچھ ہوا سو ہوا لیکن امتحان کے تقدس کو بہت دھکا پہنچا۔ لڑکے جاتے اور امتحان ملتوی کروا لیتے۔ ان کے مطالبوں کو غور سے سنتے اور ان کی باتیں بھی مانتے تھے۔ میں ایک استاد کی حیثیت سے اتنا سمجھتا ہوں کہ ڈسپلن ایسی چیز ہے جس سے طالب علموں کو تکلیف تو پہنچتی ہے لیکن اگر کوئی ادارہ اس پر کاربند ہو تو لڑکے باہر جا کر یہی کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں کی ڈسپلن ایسی اچھی ہے۔ پبلک اسکول کے بچوں کی مثالیں لی جا سکتی ہیں لیکن اس کے ذمہ دار علیم صاحب ہی نہیں تھے۔ یہ سلسلہ تو بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ استادوں کی عزت ختم ہو چکی تھی۔ اور اس میں ہم استادوں کا بھی کم ہاتھ نہیں ہے۔ بعض استادوں نے اپنے منصب کو سیاسی رہنما کا منصب سمجھ کر کام کیا۔ لڑکوں کو خوش کرنے کی عادت پڑ گئی۔ چاہے اس میں لڑکوں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کو ایک فائدہ یہ حاصل تھا

کہ وہ ہر استاد سے ذاتی طور سے واقف تھے ۔ ان کی صحت بھی اچھی نہ تھی ۔ اور پھر وہ ڈھلان پر بیٹھے ہوئے تھے ۔ ان کے زمانے میں کئی ناخوشگوار واقعے پیش آئے لیکن علیم صاحب کی سوجھ بوجھ نے ہر اک پر قابو پالیا ۔ انھوں نے اپنے منصب پر ایک سال زیادہ کام کیا ۔ ان کے جانے کے بعد پروفیسر خلیق احمد نظامی قایم مقام وائس چانسلر ہوئے ۔ انھوں نے بڑی محنت سے کام کیا لیکن وہ بعض اعتبار سے علیم صاحب کی ضد تھے ۔ طلبہ ان سے ناراض ہو گئے ۔ ڈسپلن کی عادت بھی چھوٹ گئی تھی ۔ پھر استاد بھی یوسف صاحب کے زمانے سے گروہوں میں بٹنے لگے تھے ۔ انھوں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ شام کے سفیر ہو کر چلے جائیں ۔ اور علی گڑھ ایک اچھے استاد اور محقق سے محروم ہو گیا ۔ اس کے بعد پروفیسر اے ۔ ایم خسرو ۔ وائس چانسلر ہو کر آئے جو ماہر معاشیات کی حیثیت سے نام پیدا کر چکے تھے ۔ ان کو آتے ہی لڑکوں نے گھیر لیا ۔ خوب استقبال کیا ۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کوئی وائس چانسلر طلبہ میں اتنا مقبول ہوا ہو ۔ لیکن مقبولیت یوں ہی نہیں ملتی ۔ اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے ۔ ابھی انھیں اس منصب پر چار سال اور رہنا ہے ۔ میں کافی دنوں سے علی گڑھ سے باہر ہوں ۔ اس وقت ان کے بارے میں کہنا قبل از وقت ہوگا ۔ انھیں بہت کام کرنے ہیں ۔ انھوں نے یقیناً منصوبے بھی بنائے ہوں گے ۔ کیوں کہ ویسے بھی وہ معاشیات کے آدمی ہیں ۔ میں تو دعا ہی کر سکتا ہوں کہ ان کا دور کامیاب ہو ۔ طالب علموں اور استادوں کو مل کر کام کرنے کا موقع ملے ۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ خسرو صاحب میں غیر معمولی صلاحیت ہے اور اینرجی بھی ۔ اور وہ ان دونوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔

دیکھیے بات چلی تھی علیم صاحب سے اور پہنچی خسرو صاحب تک ۔ "دلکشا" کا قصہ بیچ میں رہ گیا تھا آئیے اسے بھی پورا کر دوں ۔

ہاں تو علیم صاحب کے ابرو کے ایک اشارے سے اوپر کورٹ

نے کوٹھی خالی کر دی۔ لیکن لڑکوں کے لیے یہ تو ہین ایک چیلنج تھی۔

چنانچہ پیلی بھیت کے ایک سیاہ فام طالب علم نے ایک اسکیم تیار کی۔ کہ ایک مردے کی کھوپڑی لائی جائے۔ پھر سائنس لیبوریٹری سے فاسفورس لایا گیا۔ اب یہ حضرت رات کے بارہ بجے اپنے مشن پر نکلے۔ مادرزاد تیل اور کوئلہ ملے ہوئے۔ سر پر کھوپڑی رکھ کر ناچنا شروع کر دیا منھ سے شعلے نکل رہے تھے۔ کبھی کبھی بھیانک آوازیں سنائی دیتیں۔ گھر کے مکین جو نئے کرایہ دار تھے۔ وہ جاگ اٹھے، رات اندھیری تھی اور بھوت کا ناچ بھی ہلکا ہلکا نظر آرہا تھا۔ ان سب لوگوں کی گھگھی بندھ گئی۔ صبح کو جب ان لوگوں نے باہر نکل کر دیکھا تو مردے کی کھوپڑی پڑی ملی۔ انھوں نے تانگے منگوائے اور جو گھر سے نکلے تو مڑ کر نہیں دیکھا۔ بھوت کے ناچ کا یہ قصہ ساری یونیورسٹی میں مشہور ہوگیا۔ اور بالآخر اس کے برا نے مکینوں کی تلاش ہوئی اور چند روز بعد دلکشا کی زندگی پھر واپس آگئی۔

تو یہ ہے لوگوں کی توہم پرستی کی کہانی۔ علی گڑھ میں ہر شخص برسوں سے اسے آسیب زدہ مکان سمجھتا رہا ہے۔ اور ثبوت میں بھوت کے ناچ والا قصہ سناتا رہا۔

بات دادا کی دکان کی ہو رہی تھی اس میں ساحر یاد آگئے۔ پھر جدید اور قدیم کی بات نکل آئی۔ ساحر کا تعلق علی گڑھ سے نہیں ہے لیکن مزاج وہی قلندرانہ ہے۔ سنا ہے کہ اب بمبئی میں بڑی شان و شوکت سے رہتے ہیں۔ پہلے پیدل چلنے میں ماہر تھے۔ اب کار سے نیچے قدم نہیں رکھتے۔ سچ ہے کہ وقت اور آدمی کو بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔

ساحر جب لاہور سے دلی آئے تھے تو سنا ہے انھیں پنڈت نہرو نے بستائی شہرت دلائی تھی۔ دلی میں شاہراہ نکالتے تھے۔ لیکن ان کا عمل چاہے باغیانہ ہو یا نہ ہو، مزاج ضرور باغیانہ تھا۔ ان دنوں میں الہ آباد

میں تھا اور کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی سرگرم رکن ۔ بی ۔ ٹی ۔ رندیوے کا زمانہ تھا۔ رات کے گیارہ بجے گھر کے سامنے رکشا رکا ۔ ساحر برآمد ہوئے ۔ معلوم ہوا کہ حکومت کا عتاب نازل ہونے والا ہے ۔ اس لیے انڈر گراؤنڈ ہیں ۔ مجھ سے پوچھنے لگے ۔ "بتاؤ تمہارا گھر تو محفوظ ہے ؟"

میں نے اطمینان دلایا اور ساحر کھانا کھا کر چادر تان کر سو گئے ۔ صبح ہوئی ۔ ناشتے کے بعد ساحر نے وامق جونپوری، اعجاز صاحب، فراق صاحب، اپندر ناتھ اشک وغیرہ کے یہاں جانے کا پروگرام بنایا ۔ چنانچہ پہلے تو ہم لوگ الہ آباد پبلشنگ ہاؤس کے سید محمد ہاشم کے پاس چوک پہنچے وہاں محمود احمد ہنر اور مظفر شاہجہاں پوری سے ملاقات ہوئی ۔ وہاں سے اور آگے بڑھے تو سول لائن پہنچے ۔ یہاں کافی ہاؤس میں کون تھا جو نہیں ملا ۔ الہ آباد بھر کے صحافی، ادیب، وکیل اور نہ جانے کون کون ــــ اس وقت ساحر کو فلمی شاعر کی حیثیت سے لوگ نہیں جانتے تھے بلکہ ان کا تعارف "تاج محل" کے شاعر کی حیثیت سے ہوا کرتا تھا ۔ یہاں آکر ساحر بہت خوش ہوئے ۔ پھر وہاں سے اعجاز صاحب کے "نشیمن" پہنچے ۔ دوپہر کا کھانا اعجاز صاحب نے کھلایا ۔ شام تک وہاں محفل جمی ۔ وامق صاحب اعجاز صاحب کے ساتھ رہتے تھے ۔ الہ آباد کے ٹاؤن راشننگ آفیسر تھے ۔ یہ وہ منصب تھا جس پر شہر کا کلکٹر بھی رشک کر سکتا تھا کیوں کہ مکمل راشننگ کا زمانہ تھا ۔ چنانچہ وامق صاحب کے ساتھ بھی کچھ وقت گزرا ۔ پھر یہاں سے ہم لوگ فراق صاحب کے یہاں پہنچے پہلے تو لطیفے سنائے گئے ۔ اس کے بعد فراق صاحب نے اپنی بوتل نکالی ۔ پھر شعر و شاعری کا دور شروع ہوا ۔ کچھ ہندی کے ادیب بھی تھے جن میں شمشیر سنگھ، اونکار شرد اور ناگ ارجن کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں ۔

رات کے گیارہ بجے کے قریب فراق صاحب کے یہاں سے اٹھے ۔ جب گھر پہنچے تو ساحر نے اپنا مانوس جملہ کہا "بھئی پرویز ! تمھارا گھر تو محفوظ ہے نا ــ میں انڈر گراؤنڈ ہوں ۔"

یہ عمل کئی روز چلتا رہا۔ پھر ساحر الہ آباد سے بمبئی چلے گئے اور چند روز میں ان کے گیت سارے ہندستان میں گونجنے لگے جب مجازؔ مرحوم بمبئی سے واپس آئے اور میں نے ساحر کی خیریت پوچھی تو انھوں نے کہا "دو روز تو میں ساحر کے ساتھ رہا۔ دن بھر گھومتا تھا اور شام کو جب میرا جی چاہتا تھا کہ افلاک کی سیر کر دوں تو ساحر کو انڈر گراؤنڈ ہونے کی فکر ہوتی تھی۔ چنانچہ میں نے کہہ دیا کہ میرا اور تمھارا ساتھ نہیں نبھے گا۔"

میں پھر بہک گیا۔ بات کر رہا سنگھل اور رلا ماکی دکان سے ملی ہوئی شرما جی کی دکان کی۔ نام تو اس کا کیمرہ کرافٹ ہے لیکن پبلک اسے شرما جی کی دکان کہتی ہے۔ آج کے شرما جی کے باپ پہلے یہاں کام کرتے تھے۔ فساد ہوا تو وہ یہ دکان چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے جانے سے شمشاد کا ایک اچھا فوٹو گرافر چلا گیا۔ شمشاد والوں نے بہت چاہا کہ وہ واپس آجائیں لیکن وہ ابھی تک اپنا کھونگا "منھ میں لیے شہر میں بیٹھے ہیں۔ اس روز سے گئے ہیں تو پندرہ سال ہو گئے انھوں نے شمشاد میں قدم نہیں رکھا۔ ان کے بیٹے آج کے شرما جی ہیں۔

یہ شرما جی بھی اپنی قسم کے واحد وضع دار آدمی ہیں۔ صبح صبح آنکھیں ملتے ملتے گھر سے نکلتے ہیں۔ راستے میں اگر کوئی نظر آیا تو اسے سلام وعلیکم کرلیا ورنہ سیدھے "بچوّ ٹی اسٹال" پر آکھڑے ہوتے ہیں۔ بچوّ ٹی اسٹال سے پھر آپ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ یہ ایک ٹھیلہ ہے۔ اس ٹھیلے کی سائز یہی کوئی سوا گز لمبی اور ڈیڑھ دو فٹ چوڑی ہوگی۔ اس پر ان کی کراکری بھی رہتی ہے بسکٹ اور ضروری مٹھائی بھی، جو ان کی چائے کے ساتھ کھائی جاسکتی ہے اور ان سب پر مستزاد چولھا رہتا ہے جس کو اس تختے پر معقول جگہ مل جاتی ہے، اور یہ تختہ بڑے اطمینان سے چار سائیکلوں کے پہیے پر فٹ ہے۔ یوں تو بچوّ ٹی اسٹال ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاسکتا ہے لیکن اب عدم استعمال سے اس کے قویٰ نے جواب دے دیا ہے اور وہ حرکت سے معذور ہیں۔ اب اس کی حیثیت بھی ایک دکان کی

سی ہے اور اس کی اپنی مارکٹ ویلیو ہے۔ ایمرجنسی کے بعد بلیک کا زمانہ ختم ہو گیا ہے ورنہ اس کی پگڑی بھی اچھی خاصی ہو سکتی تھی۔ "چھوٹی اسٹال کے" ٹی ٹیسٹر" مخصوص ہیں لیکن ان میں امتیازی حیثیت شرما جی کو حاصل ہے۔ میرا خیال ہے کہ شرما جی گھر کی چائے کی لذت سے نا آشنا ہیں۔ میں نے شرما جی کو کبھی ادھر ادھر گھومتے، بیکار وقت ضائع کرتے نہیں دیکھا ہے۔ جب بھی دیکھا چھوٹی اسٹال پر ہاتھ میں پیالی لیے ہوئے۔ ان کا اسٹوڈیو عام طور پر خالی رہتا ہے اول تو تصویر کھنچوانے والے نظر نہیں آتے اور اگر آتے بھی ہیں تو شرما جی کا ذرا دیر سے نیاز حاصل ہوتا ہے۔ میں جب کبھی بھی شرما جی کی دکان کے سامنے سے گزرتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید لوگ شریعت کی سختی سے پابندی کرنے لگے ہیں اور خلاف شرع کوئی کام کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ شرما جی زبردستی پکڑ کر تصویر تو کھینچ نہیں سکتے۔

شرما جی کی شمشاد میں اچھی خاصی ساکھ ہے۔ اس بار جب دوبارہ فساد ہوا تو شرما جی کے دل میں یہ خیال بھی پیدا نہیں ہوا کہ مسلمان ان کی دکان کو گزند بھی پہنچا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی یہاں سے نہیں گئے، اور شمشاد میں ایسے نظر آتے تھے جیسے کوئی پارک میں ٹہل رہا ہو۔ شمشاد کے لوگ ان کو دیکھتے اور سر جھکا لیتے تھے کیونکہ ان کو بڑے شرما جی یاد آجاتے تھے۔ جن کی دکان لڑکوں نے لوٹ ڈالی تھی اور شمشاد والے دیکھتے رہ گئے تھے اور پھر بڑے شرما جی یہاں سے چلے گئے۔ گویا انھوں نے ایک طمانچہ مار دیا ہو۔ ہماری دکان لٹ رہی تھی اور تم سب دیکھ رہے تھے جیسے کسی نے تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ لیے ہوں۔ بڑے شرما یہاں سے دو میل دور کمٹھ پلا پار اٹھ کر چلے گئے ہیں۔ لیکن ان کے سوال کا جواب اب بھی شمشاد والوں پر قرض ہے۔

لیکن چھوٹے شرما جی شمشاد کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسی طرح "چھوٹی اسٹال" کی سرپرستی فرماتے رہیں گے۔ خدا کرے کہ محبت کا یہ

رشتہ ابد الآباد تک قائم رہے۔ آمین ثم آمین۔

فوٹو گرافر یہ یاد آیا کہ شمشاد میں ایک اور دکان کھلی ہے۔ ابھی بالکل حال ہی میں۔ لیکن فوٹو گرافر کی یہ نئی دکان اتنی تیزی سے اس ماحول کے مطابق ہو گئی ہے کہ ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوتا کہ یہ بالکل نئی ہے۔ اس کا نام ہے " زبیری اسٹوڈیو "، جب وقت یہ اسٹوڈیو کھلا اور سعید زبیری صاحب نے پردے وغیرہ ٹانگے تو ایک طالب علم بڑی سنجیدگی سے داخل ہوا اور اس نے دکان کے اندر بڑے غور سے دیکھا اور اپنے ساتھی سے بولا " اچھی طرح دیکھ لو ـــــ یہی وہ اسٹوڈیو ہے جہاں پاکیزہ کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ اور پھر وہ لڑکا گائڈ کی طرح ٹہلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

سعید زبیری بڑی محنت سے کام کرتے ہیں۔ اور کیوں نہ کریں حمید زبیری کے صاحبزادے ہیں۔ حمید زبیری پہلے کمیونسٹ تھے۔ پھر ان پر مذہبیت طاری ہوئی اور ایسی کہ انھوں نے داڑھی رکھ لی۔ اب مولانا سے لگتے ہیں لیکن نہ جانے لوگ انھیں ملّا کیوں نہیں کہتے۔ بدر باغ کے پیچھے پھولا میں رہتے ہیں حمید زبیری شمشاد کے پرانے شناسا ہیں۔ ان کی بیگم جنھیں شمشاد کے بچے بوڑھے اور عورتیں بھابی کہتے ہیں یہاں گھر گھر میں مانوس ہیں۔ یہ سوشل اور پولٹیکل ورکر ہیں۔ ایک زمانہ تھا دونوں میاں بیوی نے بڑی دھوم مچا رکھی تھی۔ یہ زمانہ تھا الکشن کا۔ اچانک ری پبلکن پارٹی کا زور ہو گیا شمشاد ایک ایسی نیام ہے جس میں دو تلواریں نہیں رہتیں۔ یہاں ایک ہی پارٹی رہتی ہے۔ سب اس کی طرف ڈھل جاتے ہیں۔ پچھلے الکشن میں کانگرس اور اور یونس سلیم کی دھوم تھی۔ لیکن اس سے پہلے والا چناؤ " ری پبلکن " کا تھا۔ گھر گھر میں اس کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔

در اصل شمشاد کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ انھیں تو زندگی سے پیار ہے چناؤ کے زمانے میں سیاست کی دھوم مچی ہوتی ہے۔ یہ زندگی

کا حصہ بن جاتی ہے تو شمشاد کے رہنے والے اس سے بے نیاز نہیں رہتے وہ بھی اسی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں۔

یہ بات بہت پرانی نہیں ہے کہ شعبہ حیوانیات کے سابق صدر پروفیسر بصیر خاں مرحوم ری پبلکن پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے چناؤ لڑ رہے تھے۔ سارا شمشاد ان کے نام سے گونجتا رہتا تھا۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی کہ شمشاد کے بچوں کو ایک مشغلہ ہاتھ آگیا تھا۔ وہ صبح سے رات تک نعرے لگاتے رہتے۔ جس پارٹی کا جلوس آتا، اس پارٹی کے نعرے لگانے میں شریک ہو جاتے ـــــ کبھی وہ نعرے لگاتے "ووٹ دیں گے ہاتھی کو"، اور کبھی چلاتے "ووٹ دیں گے بیلوں کی جوڑی کو" یہاں تک کہ یہ نعرہ بھی سنائی دیتا کہ "ووٹ دیں گے ـــــ دیپک کو"

یہاں ہر پارٹی کے جھنڈے نظر آتے تھے۔ ہر پارٹی کے نعرے سنائی دیتے تھے لیکن سچ ہے کہ یہ الکشن تھا بصیر خاں کا۔

تاہم سیاست میں بصیر خاں صاحب کا پہلا اور آخری داخلہ تھا۔ وہ سیاست سے قطعاً ناآشنا تھے۔ انھوں نے چڑھاؤ دیکھا تھا، اتار دیکھنے کی نوبت آئی تو وہ کینسر کا شکار ہو گئے۔ وہ اچھی باتیں سننا چاہتے تھے۔ بُری باتوں کے سننے سے پہلے کان میں انگلی ٹھونس لیتے تھے۔ یہ افتاد طبع اور اس پر دولت مند ان کے چاروں طرف، ایک مجمع لگ گیا۔ جنھوں نے ان کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔

ہاں تو جب پروفیسر بصیر خاں دوسری پارٹیوں کے نعرے سنتے تو پریشان ہو جاتے۔ ایک بار مجھ سے کہنے لگے "تمھارے شمشاد کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ یہاں جب آؤ دوسری دوسری پارٹیوں کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ کو نعروں سے کیا لینا ـــــ ووٹ آپ ہی کو ملیں گے۔"

بصیر خاں الکشن جیت گئے۔ زبیری صاحب اور کھابی نے ان کے الکشن کے سلسلے میں دن رات ایک کر دیا۔ لیکن یہ الکشن بصیر خاں کو راس نہ آیا۔ وہ بنیادی طور پر استاد تھے۔ سیاسی آدمی نہ تھے۔ سیاست کو شاید انھوں نے منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے اختیار کیا تھا۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ بازار کے کچھ دکاندار بصیر خاں کو گھیرے ہوئے کھڑے تھے۔ ان میں کچھ ترکاری والے تھے، کچھ خوانچے والے، اور باقی شمشاد کے لڑکے ___ یہ دکاندار بصیر خاں سے کہہ رہے تھے کہ ہم نے آپ کو ووٹ دیئے، الکشن جتوایا اور آپ نے ناپ تول کے باٹ بدل دیئے۔" یہ وہ زمانہ تھا جب شروع شروع میں کلوگرام کے باٹ چلے تھے۔ دکانداروں کو سیر چھٹانک کی عادت تھی۔ وہ سخت عذاب میں مبتلا تھے۔

بصیر خاں ان سے اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے وہ عوام سے نہیں طالب علموں سے مخاطب ہیں اور انھیں کوئی خاص نکتہ سمجھا رہے ہوں وہ کلو کے فوائد بتا رہے تھے، ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ تو اپنے تجربے کی روشنی میں اس مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ اور یہ فیصلہ کیے ہوئے تھے کہ باٹوں کی تبدیلی ان کے کاروبار کو تباہ کر دے گی۔ ان لوگوں کے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اور بصیر خاں کی جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں ان کی بے بسی کو سمجھ رہا تھا لیکن میرے بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کو کیسے اس وقت نجات دلاؤں۔ بصیر خاں نے مجھے کچھ اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں: "یہ حال ہے ان کم بخت جاہلوں کا۔ ان کو تو خدا بھی نہیں سمجھا سکتا۔"

لیکن میں آگے بڑھا۔ اور میں نے کہا یہی تو سب ظلم زیادتی ہے۔ اسی کے خلاف آپ نے بصیر خاں صاحب کو ووٹ دیا ہے۔ یہ فیصلہ ان کے جیتنے سے پہلے کا ہے اب یہ جاکر اسمبلی میں شور مچائیں گے تب کہیں معاملہ ٹھیک ہوگا۔ ابھی آپ خاموش رہیے۔ بصیر خاں سب ٹھیک

کر دیں گے۔"

تیر نشانے پر بیٹھ گیا۔ مجمع کو اطمینان ہو گیا۔ علی محمد نے اپنی دکان میں جا کر کلو کو اٹھا پھینکا اور پھر اسی سے کسی خریدار کو سودا تول کر دینے لگے۔ اور دبی ہوئی آواز میں بولے" ہم پہلے ہی جانتے تھے بصیر خاں مزدور کچھ نہ کچھ کریں گے۔"

بصیر خاں نے میرا شکریہ ادا کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ اور پھر وہ شمشاد میں کبھی نظر نہیں آئے۔ کینسر کے منحوس مرض نے ان کی جان لے لی۔

الکشن ختم ہونے کے بعد شمشاد ہمیشہ نارمل ہو جاتا ہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں یہ لوگ تو ایسے کام کچھ اس طرح کرتے ہیں جیسے کوئی مومن عبادت کرتا ہے۔

اس الکشن کی بات تو خیر ضمنی تھی۔ بات چلی تھی حمید زبیری کے بیٹے سعید زبیری سے۔ سعید نے اسٹوڈیو کھولا ہے لیکن وہ بھی شمشاد کا ایک حصہ ہے یہاں ہر وقت متعدد نوجوان بیٹھے نظر آتے ہیں بہت چھوٹی سی جگہ ہے۔ لیکن قلب مومن کی وسعت ہے۔ یہاں ایک وقت میں کم از کم دس بارہ آدمی تو نظر آتے ہی ہیں۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دکان میں دو سے زیادہ آدمیوں کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن جب آپ زبیری اسٹوڈیو دیکھیں گے تو آپ کو یہ اسٹوڈیو سے زیادہ غریب کا دل نظر آئے گا۔ کسی اجنبی کو یہ پتا نہیں چل سکتا کہ اس میں فوٹو گرافر کون ہے اور تصویر کھنچوانے والا کون ہے۔ ہر ایک طبع آزمائی کرتا نظر آتا ہے۔ لیکن جو صاحب شیروانی پہنے ہوئے آپ کا وی۔ آئی۔ پی۔ کے طور پر استقبال کریں، یہ سمجھیے کہ ہو نہ ہو یہی فوٹو گرافر ہیں۔

سعید زبیری اپنے بس بھر محنت کرتے ہیں اگر صاحب تصویر نے کچھ برا بھلا کہا تو بڑی خندہ پیشانی سے آپ کی طرف دیکھیں گے۔ ایک کان سے سنیں گے اور دوسرے کان کا استعمال حسب دستور کریں گے۔ اگر

آپ کے تیوروں میں کچھ تبدیلی دیکھیں گے تو کہیں گے "آپ پریشان نہ ہوں میں دوسری تصویر کھینچ دوں گا۔" حالانکہ وہ خوب اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ اس میں اگر کوئی بے قصور ہے تو وہ بیچارہ فوٹوگرافر اور اس سے زیادہ اس کا کیمرہ۔ لیکن وہ کبھی ماتھے پر بل نہیں ڈالیں گے اور نہ اپنے دل کو میلا کریں گے۔

میرے لڑکے کا مزاج یہ ہے کہ وہ لفظوں کے معنی جو لغت میں ہوتے ہیں صرف ان کو تسلیم کرتا ہے اور اس کا ایمان ہے کہ دنیا میں نہ کوئی بات جھوٹ ہے نہ مصلحت۔ ہر شخص کے بیان کو ماننا اور اس کی صداقت پر مہر لگاتا ہے۔ سعید زبیری سے اس کی دوستی ہے اور وہ ان کے فن کا اتنا ہی قائل ہے جتنا جدید ذہن والے پکاسو کے قائل ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ سعید زبیری کا کام بہت اچھا چل رہا ہے۔ خدا کرے یہ سچ ہو لیکن سنا ہے کہ یہ بھی سچ ہے کہ وہ مقروض ہیں۔ اور اس قرض کی ادائیگی کے بڑے بڑے جتن بھی کر رہے ہیں۔ لیکن مقروض ہونا ان کا ذاتی معاملہ ہے جہاں تک کاروبار کا معاملہ ہے انھیں کاروبار سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ مصوری تو بہر حال ایک فن لطیف ہے۔ اور اس کے لیے انسان کو بہر حال تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ان کے کاروبار پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ ان کے مزاج کے گاہک علی گڑھ میں کم نہیں ــــ اور جب تک گاہکوں کی کمی نہیں وہ اسی طرح تصویریں کھینچتے رہیں گے۔ اور اب جب کہ پاکستان جانے کا راستہ کھل گیا ہے سعید زبیری سے پاسپورٹ کے لیے ہو بہو تصویریں کھنچواتے رہیں گے۔ کیوں کہ پاسپورٹ کی تصویروں کے لیے کوئی شرط نہیں ہوتی۔ اگر آپ تصویر کے لیے کوئی شرط نہ رکھیں تو سعید زبیری سے تصویریں کھنچوانے میں کوئی حرج نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کی صحت

اچھی رہی تو ان کے کاروبار پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔ ابھی نوجوان ہیں اور ان کے سلسلے پورا کرنا ہی پڑتا رہتا ہے۔

صحبت کے اچھے ہونے پر رشید احمد صدیقی مرحوم کی نصیحت یاد آگئی۔ جو پچھلے دنوں انہوں نے مجھے کی تھی۔ کہنے لگے "میاں صحبت اچھی رکھنا یہ بڑی چیز ہے اسی سے انسان بنتا اور بگڑتا ہے۔ دو بادشاہوں کی زندگی اس کی بہترین مثال ہے۔ ایک نے صحبت اچھی رکھی۔ ابوالفضل اور فیضی کے پاس بیٹھا تو علم ان سے بھی آگے بڑھ گیا۔ حالانکہ خود بے پڑھا لکھا تھا۔ لیکن کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اور اس کے مقابلے میں ایک دوسرے بادشاہ کی زندگی کو لے لیجیے کہ ناچنے گانے والوں کی صحبت میں بیٹھا اور بیجا جان عالم کہلایا۔"

بات سچ ہے کہ رشید صاحب بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں، لیکن چونکہ خاکہ نگار بھی ہیں یہی وجہ ہے کہ انسانوں پر ان کی گہری نظر رہتی ہے اور وہ ایسی بات کہتے ہیں کہ آدمی سوچتا رہ جاتا ہے۔

یہ غالباً ۱۹۴۴ء کی بات ہے حبیب تنویر ناگپور سے بی اے کر کے آئے تھے انھوں نے ایم اے اردو میں داخلہ لیا۔ انھیں ناگپور یونیورسٹی نے بی اے میں پوزیشن لانے پر ایک اسکالرشپ بھی دیا تھا یہ اسکالرشپ ہی ان کا دشمن ثابت ہوا۔ انھوں نے داخلہ بھی لے لیا۔ اور اسٹیٹ بورڈر کے طور پر رہنے لگے۔ دودھ پور میں لالہ رخ کے پاس والے نواب صاحب کا ایک چھوٹا سا مکان لے لیا جو دودھ پور کی سڑک سے ملا تھا۔ یہ نواب صاحب خود اس مکان میں رہتے تھے۔ جس میں اب قدسیہ بیگم رہتی ہیں، حبیب تنویر برائے نام اپنے مکان میں رہتے۔ ان کا وقت تو علی گڑھ کے دوران قیام میں علی گڑھ سے زیادہ ہندوستان کے مختلف کونوں میں گزرتا کبھی کلکتے میں ہیں تو کبھی کشمیر میں۔ کبھی آسام میں ہیں تو کبھی بنگلور میں۔ غرض اس اسکالرشپ کے بل بوتے پر انھوں نے ہندوستان کی سیر کر ڈالی۔ لیکن یونیورسٹی کی فیس ...

مکان کا کرایہ وہ پابندی سے ادا کیا کرتے۔ حبیب تنویر کی عام طور پر عدم موجودگی کے زمانے میں جو خط آتے تھے، اس پر نواب صاحب کے بڑے منشی جی لکھ دیا کرتے تھے "مکتوب الیہ کا پتا نہیں ہے۔"

خیر خطوں کی تو کوئی بات نہیں لیکن ایک بار اسی مکتوب الیہ کا منی آرڈر واپس ہو گیا۔ مکتوب الیہ نے اسی منی آرڈر کے بل بوتے پر اپنا اڑیسہ جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ جب حبیب تنویر نے ڈاکخانے میں منشی جی کی یہ تحریر دیکھی تو میں کیا بتاؤں کہ ان پر کیا بیت گئی۔ یوں سمجھیے کہ محاورے کے اعتبار سے آگ بگولہ ہو گئے لال پیلے ہوتے ہوئے منشی جی کے پاس پہنچے اور بولے "منشی جی! آپ مجھے جانتے ہیں کہ میں کون ہوں؟" منشی جی نے بڑے اطمینان سے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کیوں نہیں۔ کیوں نہیں آپ حبیب تنویر ہیں۔"

حبیب تنویر غصے میں تو تھے ہی بولے "جی نہیں، میں حبیب تنویر نہیں مکتوب الیہ ہوں جس کے بارے میں آپ ڈاکخانے والوں سے خط و کتابت کرتے رہتے ہیں کہ لاپتا ہیں۔ آپ کا آٹھ روپے کرایہ ماہ بماہ دیتا ہوں اور اس پر آپ کا یہ حال ہے کہ مکتوب الیہ کا پتا نہیں۔ مکتوب الیہ کا وارنٹ جاری کروا دیتے۔"

اس درمیان میں ان کے پارٹنر عزیز حامد مدنی آ گئے۔ پھر ہم دونوں نے اس قصے کو ختم کیا۔ مدنی نے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی۔ عزیز حامد مدنی انگریزی میں ایم اے کرنے آئے تھے بے حد ذہین اور پڑھے لکھے تھے۔ شعر کہتے تھے مگر کسی کو کانوں کان پتا نہ تھا کہ شاعر ہیں۔ ان کے اشعار صرف نواب صاحب کے اس کمرے تک محدود تھے۔ مگر خاموش مزاج کے آدمی تھے۔ میں اور حبیب تنویر ان کے دوست تھے۔ میں نے کبھی ان کو تیسرے آدمی سے گفتگو کرتے نہیں دیکھا۔ وہ اگر حلقے میں جلسا چپ چاپ داخل ہو جاتے تھے اسی خاموشی

سے نکل گئے ۔

جی ہاں میں کہہ تو رہا تھا حبیب تنویر کی سیر ونلذیج والی بات اور درمیان میں عزیزہ حامد مدنی آگئے۔ حبیب تنویر تیتے چھ ماہ سے کلاس چلے جاتے تھے۔ نتیجہ وہی ہوا جس کا ہم لوگوں کو ڈر تھا یعنی وہ امتحان دینے سے روک دیے گئے ۔

آخر کار ہم تینوں کی ایک سازشیانہ کانفرنس ہوئی جس میں مدنی اور میں تو زیادہ تر خاموش تھے اور حبیب تنویر بولتے رہے اور آخر کار ان کی اسکیم کے مطابق طے ہوا کہ وہ میرے ساتھ رشید صاحب کے یہاں جائیں ۔ اور گھر پر بات چیت ہو۔ چنانچہ ہم لوگ باقاعدہ ریہرسل کر کے وہاں پہنچے ۔ رشید صاحب نے جوتے سے لے کر شیروانی تک حبیب تنویر کو نظروں سے ٹٹول کر دیکھا۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس وضع قطع اور شکل وصورت کے آدمی کو اس سے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ لیکن جب کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے تو بولے" میاں صاحبزادے! آپ کی کل حاضری کتنی ہے ؟"

اب بات ذرا آگے بڑھی تو حبیب تنویر میں ذرا اعتماد پیدا ہوا اور انھوں نے گلا صاف کرتے ہوئے فرمایا " جناب عالی اکیس فی صدی" حبیب تنویر کے لہجے میں واقعی بلا کا اعتماد تھا ۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی پر جیسے بجلی گری ۔ کہنے لگے " حضرت! کم سے کم ضروری حاضری ۷۵ فی صد ہونا چاہیے ۔ اگر اس میں ۵ فی صد کی کمی ہو تو استادوں کی سلام و دعا سے کام چل جاتا ہے ۔ اگر ۶۵ ہو تو طالب علم ذرا سا پریشان ہوجاتا ہے وہ یونین اور اسپتال کے چکر لگاتا ہے ۔ بہرحال علی گڑھ میں انسانی دوست بستے ہیں ۔ جوتے گھسنے پڑتے ہیں۔ لیکن کام ہوجاتا ہے لیکن ہاں اگر حاضری ۶۰ فی صد ہو تو ...

وائس چانسلر سے ادھر نہیں بڑھ سکتا۔ اور پھر وائس چانسلر چاہے تو کچھ کرسکتا ہے۔ بہرحال ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ایسے کام تو کر ہی دیتے ہیں لیکن بھائی اگر ۵۵ فی صد حاضری ہو تو لڑکا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتا، کچہری کے سامنے سے تانگا لیتا اور سیدھا گھر پہنچتا ہے اور پارٹنر سے دو ایک رنگ دارانہ فقرے کہہ کر اسٹیشن پر جاکر دم لیتا ہے۔ میاں تم ۲۱ فی صد پر نا امید نہیں۔ خدا تمہارے ہاتھوں ہی انقلاب کرسکتا ہے اور جہاں تک میرا تعلق ہے میرے بھائی میں مجاہد کہلانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

ہم لوگوں پر سناٹا چھا گیا۔ اور رشید صاحب میری طرف مخاطب ہوئے اور بولے "بھائی، ان کو لے جائیے اور کمیونسٹ پارٹی میں بھرتی کرا دیجیے۔ یہ آپ کے لیے بڑے کام کے آدمی ثابت ہوں گے۔"

ہم لوگ کہتے بھی کیا البتہ رشید صاحب نے ان سے ذرا آہستہ سے پوچھا "میرے بھائی ذرا یہ تو بتا دیجیے کہ یہ ۲۱ فی صدی حاضری کا عطیہ آپ کو کہاں سے ملا۔ اور اس میں آپ کو کہاں تک دخل ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے تو آپ کو شعبہ کے آس پاس تو کہیں دیکھا نہیں ہے۔"

مجھے یاد نہیں کہ حبیب تنویر نے اس کا کیا جواب دیا۔ لیکن جب ہم لوگ رشید صاحب کے پاس سے اٹھے تو تھوڑی دیر بعد حبیب نے مجھ سے پوچھا کہ "اب کس کے پاس چلنا چاہیے۔"

پھر وہ یونیورسٹی میں تو ... کے پاس نہیں گئے۔ لیکن میں نے ایک تعارفی خط اختر الایمان کے نام دیا جو اس وقت شالیمار کمپنی میں ڈبلیو زیڈ احمد کے یہاں کام کر رہے تھے۔ اور پھر وہاں سے حبیب تنویر کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوگیا۔ حبیب تنویر دراصل معزوں کے

قائل نہ تھے۔ ورنہ علی گڑھ میں معجزے بھی ہوتے ہیں۔ میں نے ان ہی دو آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ حاضری تو خیر بڑی معمولی چیز ہے۔

علی گڑھ میں قاعدے، قانون بھی چلتے ہیں۔ اور روزمرہ کا کاروبار بھی ہے۔ جہاں یہ بات آپ شمشاد سے لے کر رجسٹرار آفس تک سن سکتے ہیں کہ قانون اس لیے نہیں بنائے جاتے کہ ان کو توڑ آجائے۔ یہ سارا نظام کیوں چلتا ہے۔ آخر وکیلوں اور بیرونی کارداں کو بھی تو قانونی حیثیت حاصل ہے جن کی روزی کا انحصار ہی قانون توڑنے والوں پر ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ علی گڑھ کو میں بھی اپنے استاد پروفیسر رشید احمد صدیقی کی طرح دوسرے شہروں اور اداروں سے ذرا مختلف سمجھتا ہوں۔ بقول رشید صاحب کے حقیقت یہ ہے کہ یہاں اونٹ کروٹ نہیں لیتا۔ کروٹ اونٹ کا انتخاب کرتی ہے۔ اور اس کلیہ کی تصدیق علی گڑھ میں گاہے گاہے ہوتی رہتی ہے۔ پچھلے دنوں جب علی یار جنگ کے جانے کے بعد علی گڑھ نے کروٹ لی۔ تو ڈاکٹر عبدالعلیم کا انتخاب ہوگیا۔ اس وقت بہتوں کے دماغ میں یہ بات آئی کہ کروٹ نے اونٹ کا انتخاب کیا ہے۔

ایسے واقعات یہاں اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ مولانا راغب بدایونی کے نام سے کون واقف نہ ہوگا۔ بڑے جیّد عالم دین تھے۔ کہتے ہیں کہ علی گڑھ کے سابق وائس چانسلر اور فیڈرل کورٹ کے جج سرشاہ محمد سلیمان پٹنہ جارہے تھے۔ اسی فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں مولانا راغب البدایونی بھی سفر کررہے تھے۔

مولانا راغب جب کوئی کتاب پڑھتے تھے تو کتاب اور آنکھ کا فاصلہ مشکل سے دو انچ رہتا تھا اور وہ بھی شاید اس لیے کہ کہیں کتاب کو کوئی گزند نہ پہنچے چنانچہ وہ حسب عادت مطالعے میں مصروف رہے۔ سرشاہ نے ہمسفر سے بات کرنا چاہی اور وہی گھساپٹا مسافرانہ

سوال کیا "مولانا! آپ کہاں اتریں گے"

کہنے لگے "خدا بخش" اور پھر مطالعے میں مصروف ہوگئے۔

لیکن سر شاہ کہاں بخشنے والے تھے، انھوں نے حسب نسب تک دریافت کر لیا اور بالآخر ایک روز ان کو سلی گڑھ لے آئے۔ میں نے بہت کم استادوں کو پڑھانے کا شوق دیکھا ہے جتنا مولانا کو تھا۔ اور پڑھاتے ایسے تھے کہ لطف آ جاتا تھا۔ جب بولتے تھے تو میں سوچا کرتا تھا کہ شاید رسول اللہ پر وحی ایسے ہی نازل ہوتی ہوگی۔ جماعت میں پڑھانے میں تسکین نہ ہوتی تھی تو گھر پر پڑھاتے تھے۔ وہ اسی مکان میں رہتے تھے جس میں آجکل میرے کرم فرما پروفیسر مسعود حسن اور بیگم حامدہ مسعود رہتی ہیں۔ میں نے بہت دنوں اسی مکان میں مولانا سے تفسیر کے سبق لیے تھے۔ مولانا مجھ پر بہت مہربان تھے۔ بڑے شوق سے پڑھایا کرتے تھے۔ مجھے اجازت تھی کہ میں دین کو سمجھنے کے لیے کچھ سوالات بھی پوچھ سکتا ہوں۔ یہ زمانہ وہ تھا جب میں کارل مارکس اور لینن کا چپ چاپ مطالعہ کر رہا تھا۔ مولانا ایک روز میرے سوالوں سے عاجز آ گئے۔ اور مجھے ہمیشہ کے لیے سبکدوش کر دیا۔ کہنے لگے "صاحبزادے! دہریے ہونا چاہتے ہو تو خود ہو جاؤ۔ میرا ذریعہ کیوں تلاش کرتے ہو۔ مجھے خدا کو منھ دکھانا ہے۔"

اس کے بعد پھر جب کبھی سر راہ مل جاتے اور میں سلام کرتا تو جواب دے کر منھ پھیر لیا کرتے تھے۔

یونیورسٹی میں دینیات کا کلاس بھی عجیب چیز ہے۔ دینیات کی پڑھائی مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے لازمی ہے لیکن کوئی لڑکا پڑھنا نہیں چاہتا۔ حاضری کے ہاتھوں مجبور ہیں ورنہ ادھر کا رخ بھی نہ کرتے۔ شعبۂ دینیات میں ایک سے ایک عالم ہمیشہ رہا ہے لیکن طلبہ کے رویے میں کوئی کمی نہیں آتی۔

مجھے یقین ہے کہ اگر یونیورسٹی شعبۂ دینیات کی تعلیم کو اپنے نصاب سے ہٹا دے تو یونیورسٹی میں اتنا بڑا ہنگامہ ہوگا کہ شاید سرسید کی ڈالی ہوئی بنیادیں بھی ہل جائیں گی۔ اور ہندستان کے تمام مسلمان اس بات کو برداشت نہ کرسکیں گے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی طالب علم دینیات کی کلاس میں جانا نہیں چاہتا۔

مولانا راغب بدایونی اسی شعبہ کے رکن تھے۔ ان کی جماعت میں یوں تو ایک سو سے اوپر طالب علم تھے۔ وہ جماعت میں آکر سب سے پہلے یہ کام کرتے تھے کہ رجسٹر کھول کر حاضری لیتے تھے اور کہتے تھے کہ اب جو طالب علم درس لینا چاہے وہ ٹھہر جائے۔ باقی لوگ جاسکتے ہیں۔ ان کی زبان سے یہ فقرہ پورا بھی نہ ہوتا تھا کہ ایسا لگتا تھا کہ ساری جماعت خالی ہوگئی۔ بیس پچیس طالب علم بچ جاتے تھے۔ اور پھر مولانا پڑھانے میں ڈوب جاتے تھے۔

ایک روز وائس چانسلر پروفیسر ابوبکر احمد حلیم۔ باب العلم سے گزر رہے تھے۔ مولانا کو دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ دینیات کا کلاس ہو رہا ہے۔ طلبہ کی کم تعداد دیکھ کر انھیں حیرت ہوئی کہ دینیات کی جماعت میں اور اتنے کم طالب علم۔ چنانچہ وہ کلاس میں داخل ہو گئے۔ حاضری کا رجسٹر دیکھا کہ بھرا ہوا تھا۔ کہنے لگے کہ "مولانا یہ باقی لڑکے کہاں ہیں۔ جن کی حاضری یہاں درج ہے۔"

مولانا کہنے لگے "حضور! میں حاضری سب لڑکوں کو دیتا ہوں اور پڑھاتا صرف طالب علم کو ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ دینیات کی بدولت لڑکوں کی حاضری کم ہو۔ اور ان کا ایک سال ضائع ہو۔ اور وہ دینیات کو بُرا بھلا کہیں۔ رہ گیا میرا یہ عمل اس کے لیے میں خدا کے سامنے مدد کا خواستگار ہوں۔ اور آپ کے قوانین اپنا کام کرنا چاہتے ہیں تو

آج ہی اس منصب سے سبکدوش ہونے کے لیے تیار ہوں۔" مولانا نے یہ جملے بڑے اعتماد سے کہے۔ ہم سب حلیم صاحب کی آمد پر کھڑے تھے۔ اور دل سے مولانا کے ساتھ تھے۔ ہم بہتر نے تفنن تھے۔ لیکن چپ چاپ چلے گئے۔

اس واقعے کے بعد بار ہا حلیم صاحب باب العلم سے گزرے۔ مولانا کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ بھی اسی طرح اپنا عمل کرتے رہے۔

امتحان کے چند روز پہلے کلاس میں بھیڑ ہو جاتی تھی۔ اور مولانا وہ سب کچھ پڑھا دیتے تھے جس کی طالب علم سے امتحان کے کمرے میں توقع کی جا سکتی ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ قانون اور لاقانونیت علی گڑھ میں پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ بالکل ایسے جیسے شمشاد میں اسماعیلیہ بلڈنگ کے سامنے یا بیچ سڑک پر لڑکوں کا مذاکرہ۔

علی گڑھ میں ایک رسم اور عام ہے۔ خاص طور پر شمشاد کی سڑک پر۔ بیچ روڈ پر لڑکوں کی ٹولیاں مصافحہ کرتے، گلے ملتے اور قہقہہ لگاتے نظر آئیں گی۔ اب اگر کسی کار، ٹرک، بس یا رکشا کو ادھر سے گزرنا ہو گا تو وہ سڑک چھوڑ کر کچے میں سے گزریں گی تاکہ بات چیت کرتے ہوئے لڑکے ڈسٹرب نہ ہوں۔ دراصل شمشاد میں کوئی ٹریفک کا قانون نہیں ہے۔ گاڑیوں کو صورتِ حال کے مطابق عمل کرنا ہو گا۔

یہی رویہ کچھ لڑکوں کی پڑھائی کے سلسلے میں بھی ہوتا ہے۔ حاضری بظاہر بڑی معمولی سی چیز ہے۔ لیکن یہی حاضری طالب علموں کی کمزوری اور استادوں کی طاقت ہے۔ اسی کی بدولت سارا ظہور ہے۔ ورنہ لڑکے عام طور پر کلاس میں نظر نہ آتے۔ یہ فیس بھی جمع کر دیتے ہیں۔ دوسری تمام ڈسپلن کی پابندی کرتے ہیں۔ لیکن پڑھنے کے معاملے میں اسی

چکر میں رہتے ہیں۔ کہ کسی طرح کوئی "پراکسی" بول دے۔ اور ان کو کلاس میں نہ جانا پڑے
اگر ایسے لڑکے کبھی کلاس میں چلے جاتے ہیں تو پیچھے بیٹھتے ہیں۔ اور حاضری بولنے
کے بعد استاد کی نظر بچا کر اڑنچھو ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی دوست پوچھے کہ
"کہاں سے آرہے ہو" تو بڑی دیدہ دلیری سے کہتے ہیں "ڈاکٹر صاحب کو جھانسا
دے کر آرہا ہوں"

گویا انھوں نے استاد کو بے وقوف بنا لیا۔ میں ایسے طالب علموں سے کہا کرتا
ہوں کہ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ تم اسٹیشن پر جاؤ۔ دہلی کا ٹکٹ خریدو اور چپ چاپ
نظر بچا کر گاڑی پر آجاؤ۔ اور جب پارٹنر پوچھے کہاں سے آرہے ہو تو ایک شان
بے نیازی سے کہو "اسٹیشن ماسٹر کو بے وقوف بنا کر آرہا ہوں۔ دہلی کا ٹکٹ
خریدا اور سفر نہیں کیا"

لیکن لڑکوں پر ایسی باتوں کا کہاں اثر ہوتا ہے۔ اور اب تو گرلز کالج
کی لڑکیاں بھی "پراکسی" پر کام چلانے کی اپنی سی کوشش کرتی ہیں۔ گرلز کالج
کے بغیر علی گڑھ کا تذکرہ نامکمل رہ جائے گا۔ اس لیے لگے ہاتھوں اس کا بھی
ذکر کر دوں۔ میں گرلز کالج میں جنرل ایجوکیشن کی کچھ کلاسیں لیتا تھا۔ سیشن کا
آخری دن تھا۔ جن جن لڑکیوں کی حاضریاں کم تھیں وہ یہی عذر پیش کر رہی
تھیں کہ ہم تو برابر آرہے ہیں۔ دیکھیے آپ نے ہماری حاضری نہیں لگائی۔
(یہ بات یاد رہے کہ گرلز کالج کی لڑکیاں جب کسی استاد سے مخاطب ہوتی
ہیں تو دیکھیے کہتی ہیں۔ شروع شروع میں تو مجھے غلط فہمی ہوئی کہ ان لڑکیوں نے
میرا نام دیکھیے تو نہیں رکھ دیا لیکن بعد میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کا تکیہ
کلام ہے۔۔۔)

اپنی حاضری کی تصدیق کوئی شاہدہ سے کرا رہی تھی اور کوئی فیروزہ یا انجم
سے۔ ان لڑکیوں نے لڑکوں سے یہ سن رکھا تھا کہ میں لڑکوں سے اکثر پوچھا کرتا
تھا کہ کہیں مار پیٹ کر کے تو نہیں آئے۔ مجھے بلا وجہ پھنسا رہے ہو۔ کبھی مجھے تم لوگوں

کیجیے عدالت میں رجسٹر لیے لیے گھسٹنا پڑ رہے۔ میں عدالت میں جانے اور وہاں سچ بولنے سے گھبراتا ہوں۔

ایک لڑکی نے دوسری لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔" دیکھیے اُن کی حاضری نہیں دیجیے گا پتا نہیں کسے کیسے قتل کر کے آ رہی ہیں۔ اور بیچارے آپ رجسٹر لیے لیے پھریں۔"

وہ لڑکی شرما گئی جو دیر سے اپنی حاضری کے لیے اصرار کر رہی تھی۔ اور میں ایک استاد تھا اس لطیف فقرے پر مسکرا بھی نہ سکا۔ اور رجسٹر بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن جب میں شمشاد کی طرف آیا تو میری نظر ایک برقع پوش پر پڑی جو سمٹی سمٹائی ایک طرف چلی جا رہی تھی۔ اس کا چہرہ نقاب کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ لیکن ہر لڑکے پر جو اس کی طرف دیکھ رہا تھا مجھے ایسا لگتا تھا کہ اس پر بجلی گر رہی ہے۔ یہ بھی کتنی عجیب بات ہے کہ چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا اس کے ہاتھ برقع میں چھپے ہوئے تھے۔ لیکن پھر بھی نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن مجھے دور سے سنائی دے رہی تھی۔

یہ شمشاد بھی عجیب ہے۔ یہاں عورت کو برقع میں دیکھ کر آج بھی نوجوانوں کی وہی حالت ہوتی ہے جو برسوں پہلے ہوتی تھی۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جب پردہ ہر جگہ ختم ہو جائے گا تو بھی علی گڑھ کا نوجوان برقع کو محض اس لیے پسند کرے گا کہ وہ اس سے ایک قسم کی جنسی کشش محسوس کرتا ہے۔

میں شمشاد کے چوراہے پر اکثر بھونچکا ہو جاتا ہوں کیونکہ مجھے یہاں قدیم وجدید کا سنگم نظر آتا ہے اب یہی دیکھیے کہ ایک موٹر بیچ چوراہے پر اس لیے رکی ہوئی ہے کہ سامنے سے ایک اونٹ گاڑی قلعہ روڈ کی طرف سے آ رہی ہے یہیں چوراہے پر شمشاد کے رکشے والے کھڑے رہتے ہیں۔ یہیں لاریاں بھی آتی ہوئی نظر آ رہی ہیں اور بیل گاڑی بھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یونیورسٹی کا نووکیشن میں شرکت کے لیے صدر جمہوریہ عزت مآب فخر الدین علی احمد ہیلی کوپٹر سے یونیورسٹی

کے کرکٹ پویلین پر اترے۔ شمشاد کے بچے اور نوجوان ہیلی کوپٹر دیکھنے اس طرح دوڑے جیسے زندگی میں پہلی بار اسے دیکھنے جا رہے ہیں۔

گو کلا چورا ہے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کیونکہ مجمع ادھر چلا گیا تھا۔ ادرنٹ گا بھی والے نے بھی اپنا رخ ادھر ہی موڑ دیا تھا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ گو کلا چورا ہا کیا چیز ہے۔ شمشاد کے چورا ہے کا نام ہے جو برسوں سے چلا آ رہا ہے۔ یہ نام کٹے والوں سے زیادہ اِکّے والوں کو یاد ہے کیونکہ رکشا کا شمار تو شمشاد کے ماڈرن رسل و رسائل میں ہوتا ہے۔ یو۔پی کے پرانے رسل و رسائل کے ذرائع میں اِکّے شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ان کی وسعت قلب کا اندازہ ہوتا ہے۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں چار سواریوں سے زیادہ نہیں بیٹھ سکیں گی۔ لیکن جب سواریاں بیٹھنا شروع کرتی ہیں تو پھر ان میں گنجائش نکل آتی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دس دس سواریاں اترتے دیکھی ہیں اس میں اِکّے کا ہی کمال نہیں سواریوں کی بھی کرامت ہے۔ آزادی سے پہلے علی گڑھ میں رکشا کے نام سے لوگ واقف نہ تھے۔ اس زمانے میں تو بس دو سواریاں تھیں۔ تانگے اور اِکّے۔ تانگا ذرا مہنگا ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور لڑکیاں تانگے میں سواری کرتے تھے۔ باقی لڑکے اور عوام اِکّے پر اکتفا کرتے تھے۔ البتہ مستثنیات کہاں نہیں ہیں۔

ہماری طالب علمی کے زمانے میں ایک عربی کے استاد تھے۔ پروفیسر عبدالعزیز میمن یہ بڑے جید عالم تھے۔ اور ہندستان سے باہر بھی ان کی شہرت تھی۔ میمن صاحب علم کے معاملے میں جتنے مخیّر تھے روپے پیسے کے معاملے میں اتنے ہی کفایت شعار تھے۔ بدر باغ میں ان کا بنایا ہوا مکان آج بھی موجود ہے۔ میمن منزل' پروفیسر حبیب کی کوٹھی کے پاس ہے۔ پہلے اس میں ظفر احمد صدیقی رہتے تھے۔ آجکل فزکس کے استاد ڈاکٹر فضل رہتے ہیں۔

ویسے تو پروفیسر عبدالعزیز میمن عام طور پر تو کیا ہمیشہ ہی پیدل چلتے

تھے۔ لیکن جب انھیں چورا ہا عبدالکریم تک جانا ہوتا تھا تو اِکّے کا استعمال کرتے تھے۔ اس وقت پورا اِکّا کچہری سے چار آنے میں جاتا تھا۔ اور سواری کے حساب ایک آنہ کھلا ریٹ تھا۔ لیکن سواری جمع کرنے میں اِکّے والے کو کافی وقت لگ جاتا تھا۔ سواری بٹھا کر اِکّے والا کچہری کے سامنے چورا ہے پر گھومتا رہتا تھا۔ اور چلّاتا رہتا تھا۔ چورا ہا عبدالکریم اکنّی سواری۔ مگر گرمی ہو یا سردی سواری ملنا آسان نہ ہوتا تھا۔ میں نے پروفیسر عبدالعزیز میمن کو بارہا اِکّے پر بیٹھے اور اِکّے کے چکر لگاتے۔ اور اِکّے والے کو چلاتے سنا کہ اکنّی سواری چورا ہا عبدالکریم ـــــ بیچ بیچ میں وہ کہتا "میاں ایک گھنٹہ ہو گیا۔ زبان نکل آئی چلّاتے چلّاتے۔ آپ ایک اکنّی اور دیں تو میں آپ ہی کو اکیلے لے چلوں"۔ لیکن علامہ کبھی ٹس سے مس نہ ہوتے تھے۔ سوچنے کی بات ہے کہ جو آدمی بدر باغ سے کچہری تک پیدل چل کر آتے کیونکہ شمشاد سے اِکّا فی سواری پانچ پیسے لیتا تھا۔ اور کچہری جا کر بیٹھنے میں ایک پیسے کی بچت تھی۔ وہ چار پیسے دوسری سواری کے نام پر کیسے دیتا۔

پروفیسر میمن کی کفایت شعاری کی بے شمار کہانیاں سننے میں آتی ہیں لیکن کون اس واقعہ کو یقین کرے گا جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ علامہ عید کی نماز پڑھنے یونیورسٹی کی جامع مسجد میں آئے۔ نماز کے بعد انھوں نے ایک آدمی کو پکڑا اور اس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے پچھلی عید کے موقع پر ان کا یہ جوتا چرایا تھا جسے وہ پہن رہا تھا۔ لڑکے چاروں طرف سے میمن صاحب کو اور مولانا کو گھیرے ہوئے تھے۔ ہر ایک کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ کیونکہ اوّل تو وہ چمڑے سے تھا پھر ایک سال علی گڑھ کی دھول اور سڑکوں پر استعمال ہو چکا تھا۔

مولانا کا یہ کہنا تھا کہ وہ اس جوتے کو خوب پہچانتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے خود اس جوتے کو پانچ پیسے کا تیل پلایا تھا۔ جن صاحب کو چور سمجھا جا رہا

تھا۔ ان کا بیان تھا کہ انھوں نے یہ جوتا اس آدمی سے خود خریدا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے خود چرا کر بیچا ہو۔ ان کا یہ بیان ذہن قیاس معلوم ہوتا تھا۔ اور وہ اس جوتے کو دینے کو تیار تھے۔ وہ صورت سے اچھے خاصے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن ان کی پریشانی یہ تھی کہ وہ عید کے دن ننگے پاؤں گھر کیسے جائیں۔ پھر یہ مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ جوتا میمن صاحب کو ملا۔ اور سر سید ولسیٹ ہوسٹل کے ایک لڑکے نے اپنا اس سے کہیں زیادہ قیمتی سینڈل ان صاحب کو نذر کیا ـــ اور میمن صاحب اپنا جوتا لے کر خوش خوش اپنے گھر گئے۔

میاں نے اس روز مولانا کے چہرے پر مسرت دیکھی وہ اندرا گاندھی کو جے پور کا خزانہ پا کر بھی نہ ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ علامہ محنت سے پڑھاتے تھے۔ اور بڑی دیانتداری سے اپنا کام کرتے تھے۔ اور ان کا حق تھا کہ وہ اپنے پیسے کو غیر معمولی احتیاط سے خرچ کریں۔

تو یوں سمجھیے کہ گوکلا کا چوراہا وہ ہے جہاں سے پہلے اِکّے کی پانچ پیسے سواری چوراہا عبدالکریم کو جاتی تھی۔ کیا زمانہ بدل گیا ہے اب یہی رکشا والے اتنی دور کے دو روپے لیتے ہیں اور اس میں بھی دس باتیں الگ سے سناتے ہیں۔ تو یہ ہے گوکلا کا چوراہا۔

آج بھی اِکّے گوکلا چوراہے کے آس پاس نظر آتے ہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ یہ نام کس نے رکھا۔ یہ مٹھائی والے لالہ کے دادا کے نام سے منسوب ہے۔ لالہ کی دکان چوراہے کے پاس کانفرنس کی عمارتوں کے سامنے نکلی ہوئی ہے۔ اور جس نے چوراہے کی شکل کو بدل دیا ہے۔

جب موجودہ لالہ نے باپ کے مرنے کے بعد کاروبار سنبھالا تو دکان کی باقاعدہ مرمت کی تو اس کی شکل بدل کر رکھ دی۔ خاصا پیسہ لگا کر اپنے کام کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ یہ تین بھائی محبت سے رہتے

اور مل جل کر کام کرتے ہیں۔

شمشاد کے مسلمان دکاندار لالہ کو ہمیشہ شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ لالہ کا تعلق جن سنگھ سے ہے۔ اس معاملے میں سب دکاندار شمشاد کو دریا اور اپنے آپ کو مگرمچھ سمجھتے ہیں۔ اور غالباً اختلاف کی یہی وجہ ہے۔

اس کے باوجود لالہ اور شمشاد کا سمبندھ بہت گہرا ہے۔ لالہ کے بغیر میں شمشاد کا تصور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شمشاد کی زندگی میں جو رنگارنگی اور تنوع ہے اس میں لالہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اور ان کے بغیر شمشاد کی کہانی ادھوری رہے گی۔

اگر کبھی لالہ بڑے شرما کی طرح اس بازار کو چھوڑنا چاہیں تو مجھے یقین ہے کہ شمشاد کے لوگ ان تمام پرندوں کی طرح ہو جائیں گے جن کے درمیان نظیر اکبر آبادی "ہنس" کو لائے تھے۔ لیکن یہ سفر لالہ کو اکیلے نہ طے کرنا پڑے گا۔

لالہ کی دکان اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر ممتاز حیثیت رکھتی ہے یہ بڑی پُرامن دکان ہے۔ یہاں کبھی جھگڑا نہیں ہوتا۔ طالب علم بھی لالہ کے رکھ رکھاؤ کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ لالہ کی مٹھائی کی دکان میں چائے کا ہوٹل ہے۔ چائے کے ہوٹلوں میں عام طور پر لڑکے اپنے جھگڑے چکانے آتے ہیں۔ لیکن لالہ کے ہوٹل میں کبھی ایسے واقعات سننے میں نہیں آئے۔

اوپر کی منزل میں لالہ اور ان کی بیوی اور بچے شمشاد کی عزت و آبرو کی طرح رہتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ شمشاد کے بغیر لالہ اور ان کے بھائی نہیں رہ سکتے۔

شمشاد میں علی محمد کی دکان کے سامنے ترکاری والوں کی قطاریں ہیں۔ یہ دن بھر ترازو لیے کھڑے رہتے ہیں۔ اور یہیں علی محمد کی دکان کے

پاس نان بائی کی دکان ہے۔ اور اسی سے ملی ہوئی مطیع الرحمٰن کی مٹھائی کی دکان ہے۔ بیس برس ہو گئے لیکن مجھے یہاں زرا سا بھی فرق نظر نہیں آیا۔ سوائے اس کے کہ مطیع الرحمٰن کے چہرے پر ایک داڑھی کا اضافہ ہو گیا ہے ان کا مٹھائی کا کاروبار اسی طرح چل رہا ہے۔ جیسے پہلے چلتا تھا۔ ٹرک والے جب رات کو ادھر سے گزرتے ہیں تو یہاں زندگی کی رمق پاتے ہیں اور زرا سی دیر کے لیے اپنے گاڑی کے انجن کو ٹھنڈک اور اپنے پیٹ کو غذا کی گرمی پہنچاتے ہیں۔

جہاں تک نان بائی کا تعلق ہے اس کے یہاں بدستور نان بنتے ہیں۔ یونیورسٹی کے نفاست پسند طالب علم بڑے شوق سے یہاں کھاتے ہیں۔ جب یہ لڑکے چلے جاتے ہیں تو پھر کتے آتے ہیں۔ کیونکہ اس کان کا دستور ہے کہ جب یہاں کتے رہتے ہیں تو آدمی نہیں رہتے۔ اور آدمی رہتے ہیں تو کتے نہیں رہتے۔ بس کتوں کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ یہ دکان ان کا رین بسیرا بھی ہے۔ کتے اور آدمی کے یہ تعلقات نہ جانے ہمارے معاشرے میں کب سے چلے آرہے ہیں۔

شمشاد میں کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک روز سننے میں آیا کہ کوئی چور پکڑا گیا۔ اس نے کسی دکان سے کوئی سامان اٹھایا تھا۔ لوگوں نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا کبھی کبھی جماعتی طور پر شوق ہوتا ہے۔ چنانچہ شمشاد میں دکانداروں اور ان سے زیادہ بیکار نوجوانوں نے اس کو پکڑ لیا۔ پہلے تھوڑی بہت پٹائی کی۔ اس کے بعد کسی منچلے کو سوجھا۔ اور اس نے سوچا کیوں نہ اس کا سر مونڈا جائے۔ چنانچہ امین صاحب کی طلبی ہوئی وہ اپنا کام چھوڑ کر استرا لے کر آموجود ہو گئے۔ اور اس کا سر زراسی دیر میں صفاچٹ کر دیا گیا اس نے بھی [illegible] مار کھانے اور پولس تھانے میں جانے کے مقابلے میں

اس عمل کو ترجیح دی۔ اور خوشی خوشی استرا چلوا لیا۔ اب تو بہت لوگ خوش ہوئے اور اسے معاف کر کے رخصت کر دیا۔

بعد ازاں نہ جانے کس نے چوکو یہ رائے دی کہ تم جا کر پولیس والوں سے کہو کہ مسلمانوں نے پکڑ کر میرا سر مونڈا اور زبردستی میری چٹیا کاٹ ڈالی۔ جس کے نتیجے کے طور پر میرا سناتن دھرم خطرے میں پڑ گیا۔ بس پھر کیا تھا پولیس کو ایک کام ہاتھ آ گیا۔ اور پولیس نے شمشاد کے چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔ امین صاحب نے کسی نہ کسی طرح اپنا پیچھا چھڑایا۔ تیسرے چوتھے روز کوئی نہ کوئی پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تھا۔ بہرحال پولیس کو موقع ملا۔ اور شمشاد میں بہت دنوں کا نا پھوسی ہوئی۔ پھر اپنے آپ یہ مرحلہ دبا دیا گیا یا اپنے آپ دب گیا۔

ویسے شمشاد میں عام طور پر دن کے وقت نسبتاً خاموشی رہتی ہے۔ شمشاد میں زندگی دو تین بجے کے بعد زور پکڑتی ہے۔ البتہ اگر کسی کے مرنے کی یونیورسٹی میں چھٹی ہو جاتی ہے تو شمشاد کی رونق صبح سے شروع ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جب تعزیتی جلسہ ہوتا ہے تو اس کا سوگ محض رسمی ... منایا جاتا ہے۔ اس لیے طالب علم عام طور پر اس جلسے میں شریک نہیں ہوتے۔ مجھے یاد ہے کہ جب اردو کے مشہور ادیب انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سیکریٹری اور "لیلیٰ کے خطوط" کے مصنف قاضی عبدالغفار کا انتقال ہوا اور یونیورسٹی بند کر دی گئی۔ تو اس تعزیتی جلسے میں گنتی کے چند آدمی موجود تھے۔ ذاکر صاحب کو جلال آ گیا۔ اور انھوں نے ... بڑے جذباتی انداز میں کہا: "میں آپ حضرات سے گزارش کروں گا کہ میرے مرنے پر یونیورسٹی میں چھٹی نہ کی جائے۔"

ذاکر صاحب نے بڑی دردمندی سے کہا تھا۔ دراصل ایسے تعزیتی جلسے یونین میں ہوتے ہیں۔ یا اسٹریچی ہال میں یا آرٹس فیکلٹی

لاؤنج میں یا پھر کینیڈی ہاؤس کے عظیم ہال میں۔ لیکن یہ سب حسب حیثیت یا حسب منصب ہوتے ہیں۔ دراصل یہ وقت ہال میں جانے کا نہیں، شمشاد میں آنے کا ہوتا ہے اس لیے اگر کہیں شمشاد میں کوئی ایسی جگہ ہوتی جہاں تعزیتی جلسے ہو سکتے تو مجھے یقین ہے کہ ذاکر صاحب کو مایوسی نہ ہوتی۔ دراصل تعزیتی جلسے ذاکر صاحب کی نفسیاتی کمزوری تھا۔ یہ بات بہت پہلے کی ہے صدر جمہوریہ، نائب صدر جمہوریہ اور گورنر بہار ہونے سے بہت پہلے کی بات۔

ذاکر صاحب حیدر آباد میں ایک جلسے میں تشریف لے گئے۔ انھیں ہال میں پہنچنے میں ذرا سی دیر ہوگئی جب ذاکر صاحب ہال میں داخل ہوئے تو حاضرین جلسہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ذاکر صاحب تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ اور انھوں نے حاضرین کو بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا۔ لیکن یہ لوگ اسی طرح کھڑے رہے بیٹھے نہیں۔ ذاکر صاحب کے متواتر اصرار کے باوجود اپنی جگہ ساکت وجامد کھڑے تھے۔ ذاکر صاحب بہت بے چین تھے کہ اتنے زبردست اعزاز کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن دو منٹ کے بعد بیٹھ گئے۔ تب معلوم ہوا کہ یہ حضرات ذاکر صاحب کی وجہ سے نہیں کھڑے ہوئے تھے بلکہ وہ ایک تعزیتی تجویز کے احترام میں دو منٹ کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ اور ذاکر صاحب کے علم میں یہ بات نہ تھی)۔ اور جب انھیں معلوم ہوا تو بے حد شرمندہ ہوئے۔ ایک روز ذاکر صاحب کہہ رہے تھے کہ جب کسی تعزیتی جلسے میں شریک ہوتا ہوں تو مجھے بڑی شرمندگی کے ساتھ یہ واقعہ یاد آجاتا ہے۔

بات شمشاد کی رونق سے شروع ہوئی تھی۔ شمشاد کی رونق طالب علموں کے دم سے ہے۔ جو یونیورسٹی کے کلاس ختم ہونے کے بعد ہی بازار میں داخل ہوتے ہیں۔ اور پھر اس وقت شمشاد اتنا خوش ہوتا ہے جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر ہوتی ہے۔

برسوں پرانی بات ہے غالباً سترہ اٹھارہ سال پہلے کی۔ جاں نثار اختر میرے پاس آئے۔ اور میرے روم کی کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گئے اور شمشاد کو دیر تک خاموشی سے دیکھتے رہے۔ وہ مجھ سے اپنے بیٹے جاوید اختر کے بارے میں مشورہ کرنے آئے تھے۔ جاوید جنھیں سب پیار سے جادو کہتے تھے۔ یہ نام شاید مجاز مرحوم کا رکھا ہوا تھا۔ جو اپنے اس بھانجے سے بے حد پیار کرتے تھے۔ ان دنوں یہ صاحبزادے یونیورسٹی اسکول میں پڑھتے تھے۔ میں بچوں کا ایک ڈراما کر رہا تھا۔ جس میں جادو کا ایک اہم رول تھا۔ ڈراما تیار ہو گیا۔ شو کا دن ہی نہیں وقت بھی قریب آگیا۔ لیکن عین وقت پر مشکل پیش آئی۔ ایک اداکار نے کسی وجہ سے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ وقت وہ تھا کہ مہمان آچکے تھے۔ پردہ اٹھنے کا انتظار تھا۔ کہ مجھے یہ خبر ملی سخت پریشان ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں کہ اتنے میں جادو میرے پاس آئے۔ اور بولے "آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ رول بھی میں کر دوں گا۔ بس صرف آپ اتنا کریں کہ جہاں جہاں میرا اور اس کیریکٹر کا سامنا ہوتا ہے۔ اس میں تبدیلی کر دیں باقی میں کر لوں گا۔"

میں نے کہا "ڈائلاگ کا کیا ہوگا۔ اس کے ڈائلاگ بڑے لمبے لمبے ہیں۔"

جادو نے کہا "مجھے پورا ڈراما زبانی یاد ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ بس میک اپ کرا دیں۔"

چنانچہ یہ ڈراما اسٹیج ہوا۔ جادو نے دونوں رول کیے۔ اور اتنے کامیاب کیے کہ ڈرامے کے بعد کرنل زیدی نے ان دونوں ایکٹروں سے ملنے کی خواہش کی۔ حالانکہ یہ دونہیں ایک ہی تھے۔ یہ ڈراما میرا نہیں جادو کا بن گیا۔ جادو کی ذہانت اور۔ اس کی خاندانی شرافت کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ جہاں ایک طرف اس کا شجرہ خاندانی اور ایک طرف جاں نثار اور مضطر

خیرآبادی سے ملتا تھا، وہاں دوسری طرف ان کا رشتہ مجاز اور انصار ہروانی سے بھی تھا۔
جاں نثار اختر علی گڑھ آتے تھے۔ جاوید کو بمبئی لے جانے کے لیے۔ کسی نے میرا
نام لے دیا کہ آجکل ان کے ڈرامے میں کام کر رہا ہے۔ ان سے بھی رائے لے لیجیے۔
میں کیا رائے دیتا میں نے صرف اتنا کہا " بھائی! اتنے ذہین لڑکے کی تعلیم و تربیت
کی طرف دھیان نہ دیا تو خدا جانے یہ لڑکا کیا کیا کرے۔ اتنے ذہین لڑکے کی
پرورش آسان نہیں ہے۔" ظاہر ہے کہ یہ ذہانت جاوید کو اپنی ماں صفیہ، اپنے ماموں
مجاز اور اپنے باپ جاں نثار اختر سے ملی۔ اور اسی لیے سہ آتشہ ہو گئی۔

صفیہ پر یاد آیا۔ مجاز کی سگی بہن تھیں۔ بلا کی ذہین تھیں۔ ۱۹۳۴ء کی بات
ہے۔ علی گڑھ کی سالانہ نمائش کا زمانہ تھا۔ اس میں لڑکیاں عام طور پر کیا کہ
تقریباً سب ہی برقعہ پہنتی تھیں۔ اس نمائش پر بڑی پابندیاں تھیں۔ لیکن
تب بھی لڑکے ایک آدھ جملہ کس ہی دیتے تھے۔ اس نمائش میں دہلی بازار سے
اک دکان آیا کرتی تھی اس کا نام تھا " بھائیوں کی دکان " یہاں سرمہ کاجل اور
لڑکیوں کی ضرورت کا سامان ملا کرتا تھا۔ چنانچہ صفیہ اپنی کچھ دوستوں کے
ساتھ کھڑی " بھائیوں کی دکان " سے کچھ سامان خرید رہی تھیں۔ ایک من چلے
نے ایک جملہ کسا " کاش ہماری بھی بھائیوں کی دکان ہوتی تو ہمارے یہاں
بھی بھیڑ ہوتی۔"

صفیہ نے مڑ کر کہا " پریشان مت ہوئیے۔ بھائیوں کی دکان نہیں ہے
تو بہنوں کی رکھ لیجیے۔ بہت بھیڑ اکٹھا ہو جائے گی۔"

اور یہ جملہ بہت دنوں تک یونیورسٹی کیمپس میں سنائی دیتا رہا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جاں نثار اختر کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے شمشاد
کو دیکھتے رہے۔ شاید انھوں نے میری بات نہیں سنی۔ البتہ جب اٹھنے
لگے تو یہ جملہ ان کی زبان سے نکلا " کبھی یہ بازار کبھی نہ بدلے گا۔"

جاں نثار کی یہ بات سترہ اٹھارہ سال پہلے کی ہے۔ جب جاوید اختر نے

اس سے پہلے کے پچیس برسوں کو یاد کرتے ہوئے کہی تھی۔ سچی بات ہے کہ ان کی یہ بات آج بھی اتنی ہی سچی ہے۔

شمشاد جہاں طالب علموں کی سرگرمیوں کا مرکز ہے وہاں استاد اور ادیب و شاعر بھی یہاں خوب نظر آتے ہیں۔ یہاں آپ کو ہفتے میں تین چار دن اختر انصاری نظر آئیں گے۔ وہ ہمیشہ اس بازار میں اسی طرح نظر آئیں گے۔ وہ ہمیشہ شمشاد میں اسی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ رنگین چشمہ شوخ رنگ کے کپڑے اور ہرا لال یا پیلا جوتا۔ اختر انصاری اپنے جوتے اور کپڑوں کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں اسی لیے وہ آپ کو کبھی کبھی ایک رومال سے اپنے کپڑے اور دوسرے سے اپنے جوتے جھاڑتے نظر آئیں گے ــــ وہ اس بازار کی دھول سے بہت جھنجھلاتے ہیں۔ مگر وہ جب یہاں آتے ہیں تو گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا یہاں ضرور گزارتے ہیں۔ ان کی دکانیں مخصوص ہیں۔ جبار صاحب کے یہاں وہ تمباکو یا ضرورت کی کوئی چیز خریدیں گے۔ عطاء اللہ کے یہاں سے اپنی کتابوں کی خیریت دریافت کریں گے۔ اور بشیر صاحب کی دکان پر دیر تک عرفانی صاحب اور دوسرے احباب سے گفتگو کریں گے۔

اختر انصاری اپنی رنگا رنگ شخصیت کی بنا پر دور سے نظر آتے ہیں۔ اس لیے لوگ ان کو دیکھ کر ہی ان کے پاس آجاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو دکانیں بھی بند ہو جاتی ہیں لیکن اختر انصاری بازار میں نظر آتے ہیں۔

اختر صاحب کی شخصیت بعض اعتبار سے بڑی دلچسپ ہے۔ وہ ہمیشہ زندگی کا تاریک پہلو دیکھتے ہیں۔ شاید اسی لیے انھیں مایوسی نہیں ہوتی۔ اور جب بھی ان کی کوئی مراد پوری ہوتی ہے تو وہ سوچنے لگتے ہیں کہ ساقی نے ضرور جام میں کچھ نہ کچھ ملا دیا ہے۔

اختر انصاری شعبۂ تعلیم میں لکچرر تھے۔ ان کے پاس ایم۔ایڈ کی ڈگری نہیں تھی اس لیے وہ ریڈر نہ ہو سکے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ بہت سی کتابوں کے

مصنف بھی ہیں اور ایم ایڈ کے طالب علموں کو پڑھاتے بھی ہیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی ان کو کئی بار محض اس لیے توسیع ملی کہ جو مضمون وہ پڑھاتے ان کا سا پڑھانے والا دستیاب نہ ہوتا تھا۔ یہ حق تلفی اس زمانے میں ہوئی جب پروفیسر عمر الدین آرٹس فیکلٹی میں ڈین تھے۔ اور خود پروفیسر موصوف نے اس زیادتی میں نمایاں رول ادا کیا۔ اختر انصاری اس سانحہ کو کبھی نہ بھولے اور بھولنے کی بات بھی نہ تھی کیونکہ اس میں منصب کی بات نہیں جتنی ہم چشموں میں توہین کا احساس ہوتا ہے۔ علی گڑھ میں ایسے قتل برابر ہوتے رہتے ہیں اس لیے لاشوں کی گنتی نہیں ہو سکتی۔

ایک روز صبح صبح اختر انصاری ٹہلتے ہوئے آرہے تھے۔ سامنے سے پروفیسر عمر الدین کا جنازہ منٹو ای (یونیورسٹی قبرستان) کی طرف جا رہا تھا۔ سب کی نگاہ اختر انصاری پر پڑی، جو عالم بے نیازی میں ادھر سے گزر رہے تھے۔ کسی نے اختر صاحب کو مخاطب کیا: ”پروفیسر عمر الدین کا جنازہ ہے، آپ بھی کندھا دے دیجیے۔“

اختر صاحب نے کہا ”کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ کسی مقتول نے کسی قاتل کے جنازے کو کندھا دیا ہے؟“ یہ کہہ کر اختر انصاری صاحب اسی بے نیازی سے ٹہلتے ہوئے چلے گئے اور پروفیسر عمر الدین دفنا دیے گئے۔

اختر صاحب اب بہت دور رہنے لگے ہیں۔ انھوں نے دودھ پور میں جامعہ اردو روڈ پر اپنا مکان بنوا لیا ہے۔ دودھ پور کا بازار ان کے گھر سے بہت قریب ہے لیکن وہ اپنی ضرورت کا سامان شمشاد سے خریدتے ہیں۔ چنانچہ وہ دودھ پور کی بجائے گوکلا چوراہے کے آس پاس نظر آتے ہیں۔

گوکلا چوراہے کے پاس پروفیسر نور الحسن کی شاندار کوٹھی ہے

اس سے ذرا آگے کو بڑھیے تو ولی منزل ہے۔ اس میں ایک طرف بیگم شہلا مونس رضا رہتی ہیں۔ اور دوسری طرف پروفیسر خورشید الاسلام ۔۔۔ خورشید صاحب بار ہا انگلستان جا چکے ہیں۔ آکسفورڈ میں ان کا اپنا مکان ہے۔ ان کے بال بچے وہیں رہتے ہیں۔ لیکن خود ان کا جی ولی منزل میں لگتا ہے۔ شمشاد میں وہ بہت کم نظر آتے ہیں لیکن جب کبھی نظر آتے ہیں تو جبار صاحب کے یہاں سگار لینے کے لیے تو ان کو دیکھ کر بازار کے اکثر دکاندار انھیں بڑھ کر سلام کرتے ہیں۔

خورشید صاحب آزادی سے پہلے یونیورسٹی یونین کے بڑے زبردست مقرر تھے۔ ان تقریروں کی آوازیں آج بھی اسٹریچی ہال اور حامد ہال کی دیواروں سے چپکی ہوں گی۔ وہ آفتاب ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۹ میں رہتے تھے۔ اور جب قہقہہ لگاتے تو شعبۂ انگریزی تک اس کی آواز سنائی دیتی تھی۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے "ہیرالڈ کاکس پرائز ہولڈر" ہیں۔ یہ اعزاز بہت کم لوگوں کو ملا ہے۔ ایسے مقرر علی گڑھ میں کبھی کبھار آتے ہیں۔ اب انھوں نے اس فن کو ترک کر دیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی جب وہ کہیں تقریر کرتے ہیں تو پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

خورشید الاسلام اپنی نثر کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ علی گڑھ میں پہلے وہ شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ اور ایک زمانے میں ان کے اشعار سے جہاں ایک طرف مولانا ضیاء الدین بدایونی کی ناک بھوں چڑھ گئی تھی وہاں دوسری طرف سید سجاد ظہیر کے ماتھے پر بھی بل پڑ گئے تھے۔

اس زمانے کے چند اشعار آج بھی اس عہد کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ جیسے ان کی ایک نظم کے چند مصرعے جو اس زمانے میں بہت زبان زد تھے۔

مستی میں جہاں کار نے پھینکا ہے سبو کو
میخوار ترستے ہیں ترس جائیں وضو کو
ہم رقص بہ اندازۂ انجام کریں گے
بے نام عبادت سحر و شام کریں گے

خورشید صاحب اپنی طالب علمی کے زمانے میں بھی خوب جانے پہچانے تھے۔ یونیورسٹی کے طلبہ کی سیاست کے اہم فیصلے ان کے کمرے میں ہوا کرتے تھے۔ خاص طور پر یونین کے الکشن۔

یونیورسٹی میں یونین کے الکشن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ الکشن شمشاد کی زندگی میں بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یونیورسٹی کا الکشن تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ شمشاد سے شروع ہوتا ہے۔ سارے فیصلے ٹی ہاؤس، سیون اسٹار یا ایسے ہی کسی چائے خانے میں ہوتے ہیں۔ پہلے چائے پی جاتی ہے۔ پھر سینئر دلبا پر بحث ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد امیدواروں کے نام زیر بحث آتے ہیں۔ پھر الکشن کے پوسٹر سب سے پہلے یہیں نظر آتے ہیں۔ اسلیا رخاں کی دکان کے سامنے ایک نوخیز پیڑ کے سایے میں جھکے جھکے چند طالب علم بحث کرتے ہوئے نظر آتے ہیں پھر یہ بات عام ہو جاتی ہے اور الکشن کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ یونیورسٹی کا الکشن یہاں کی تہذیبی زندگی کا ایک خاص حصّہ ہے۔

شمشاد کے بچّے جیسے قومی الکشن میں نعرے لگاتے ہیں، ایسے ہی ان میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔ یہ ہر اک کے ساتھ ہیں۔ اور ان کا بس چلے تو ہر اک کو جتا دیں۔ الکشن کی رات کا جلوس، وہ آخری پردہ ہے جو اس الکشن پر گرتا ہے۔ اور اس روز لڑکوں کا جلوس جب شمشاد میں آتا ہے تو شمشاد کو اس جلوس کا ایسا ہی انتظار رہتا ہے۔ جیسے بیٹا بیاہنے کے بعد جب وہ ماں کو سلام کرنے کے لیے جاتا ہے تو

ماں اس کا انتظار کرتی ہے۔

کسی زمانے میں اس جلوس کا نام جنازہ تھا یہ جنازہ نکالنا خدا جانے علی گڑھ والوں نے کہاں سے سیکھا۔ لیکن اس میں ان کی انفرادیت تھی۔ دراصل علی گڑھ کے الکشن کی جہاں اور خصوصیات تھیں وہاں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ الکشن امیدواروں کے درمیان نہیں ہوتا تھا۔ یہ ہوتا تھا کارکنوں اور سینیروں کا الکشن کیونکہ امیدوار کی حیثیت تو محض لوکن کی سی تھی جس کو سینیر کھڑا کر دیتے تھے۔ خاص خاص سینیر ورکر کام کرتے تھے۔ اور الکشن کے فیصلے کے بعد جب جنازہ نکلتا تھا تو دھوم سے نکلتا تھا۔ یہ مصرع کون بھول سکتا ہے ؎

عاشق کا جنازہ ہے زرا دھوم سے نکلے

دراصل یہ جنازہ کسی ایک فرد کا نہیں ہوتا تھا۔ یہ کسی جماعت کا بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ ہوتا تھا ان تمام غلاظتوں کا جو الکشن کے زمانے میں پھینکی گئی تھیں۔ اور جن میں بدبو آتی تھی۔ یہ جنازہ تھا ان تمام گندے الزامات کا جو ایک دوسرے پر لگائے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ الکشن کے زمانے میں کتنی خرافات باتیں ہوتی ہیں۔ جس کے منھ میں جو آتا ہے کہتا ہے اور نتیجہ نکلتا تھا تو ان سب کو دفنانے کا اک شدید جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ ان باتوں کو کوئی سننا پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ جنازہ واقعی دھوم سے نکلتا تھا۔ جگہ جگہ بھیڑ ٹھہر جاتی تھی۔ مرثیے اور نوحے پڑھے جاتے تھے۔ اور اس طرح وہ فضا دھل جاتی تھی۔ اور اگلی صبح جب طلوع ہوتی تھی۔ تو بادل چھٹ چکے ہوتے تھے۔ دلوں کے غبار مٹ جاتے تھے۔ کدورتیں ختم ہو جاتی تھیں۔ اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یونین کا نائب صدر، سکریٹری اور دوسرے عہدیدار کسی جماعت کے نہ ہوتے تھے۔ بلکہ وہ پوری یونیورسٹی کے نمائندے ہوتے تھے۔

لیکن بہت جلد نقشہ بدل گیا۔ یہ برائیوں کا جنازہ' ہارنے والے امیدوار کا جنازہ بن گیا۔ اور پھر جھگڑوں کا سلسلہ بہت دور تک پہنچا۔ بالآخر جب

معاملات بہت آگے بڑھ گئے تو ایک دن یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد نے جنازے پر پابندی لگا دی۔

یہاں سوچنے کی بات ہے کہ کس طرح ایک اچھی روایت کا خاتمہ ہوگیا۔ روایت کی بات آئی تو میں اس سلسلے میں چند باتیں اور کہہ دوں۔ علی گڑھ میں عام طور پر "روایت" کا لفظ بہت غلط معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ رسم و روایت کو ایک دوسرے سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ رسمیں اچھی بھی ہوسکتی ہیں۔ اور بُری بھی۔ لیکن روایت کبھی بُری نہیں ہوتی۔ جب کوئی رسم بہت دنوں تک چلتی رہتی ہے اور معاشرہ ان کو اپنا لیتا ہے تو وہ روایت بن جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی سماج میں کوئی رسم بہت عرصے تک چلے۔ لیکن معاشرہ ان کو اچھی نظر سے نہ دیکھتا ہو۔ اور ہضم نہ کرسکے تو وہ رسم روایت نہ بن سکے گی۔

مثال کے طور پر ہندستانی سماج میں ستی کی رسم بہت دنوں تک چلی لیکن سماج کے بہترین عناصر نے ان کو کبھی پسند نہیں کیا۔ چنانچہ یہ رسم جتنے عرصے رہی اسے ہمارے سماج میں روایت کا درجہ نہ مل سکا۔ یہی حال چھوت چھات کا ہے کہ ہزاروں سال سے یہ رسم چلی آرہی ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے کے بہترین عناصر نے اسے پسند نہیں کیا۔ اور آج ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چھوت چھات ہماری تہذیبی روایات میں ہے۔

ہندستان کے مختلف مذاہب اور اقوام نے اس ملک کو اپنی پناہ گاہ سمجھا۔ یہاں آریہ آئے۔ پارسی آئے، بدھ مت کے ماننے والے آئے، چینی آئے، اور یہاں کے لوگوں نے ان کا استقبال کیا۔ اور ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ ہندستانی معاشرے کی روایت ہے کہ ہم اپنے مہمانوں کا استقبال کرتے اور اگر وہ یہاں رہنا چاہتے ہیں تو انہیں ٹھکانا دیتے ہیں۔

ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات بھی ہوتے ہیں لیکن یہ ہماری

روایت نہیں ہے۔ ہماری روایت ہے کہ یہاں ہندو مسلمان مل جل کر رہتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہتے ہیں۔

بات علی گڑھ کی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ اکثر لوگ اس لفظ کو غلط معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اور غلطی سے کہتے ہیں کہ علی گڑھ کی روایت ہے کہ سینیر طالب علم، جو جونیر طالب کی "کھنچائی" کرتے ہیں۔ انھیں پریشان کرتے اور ستاتے ہیں۔ علی گڑھ کی روایت ہے کہ ہم موسم کی پہلی بارش پر ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے، بدتمیزی کرنے اور پرانی دشمنی کا حساب چکاتے ہیں — ہم یونین میں اسپیکر کی ہوٹنگ کرتے ہیں۔ ہم مشاعرے میں ٹوپی ٹوپی چلا کر شاعر کو اس کا کلام نہیں پڑھنے دیتے۔

یہ روایت نہیں ہے۔ یہ بُری باتیں ہیں۔ روایت پر انسان فخر کرتا ہے۔ اور برائیوں پر شرمندہ ہوتا ہے۔ یہ برائیاں چاہے کتنی چلیں لیکن یہ روایت نہیں بنتی۔

علی گڑھ کی روایت ہے۔ مہمانوں کی عزت کرنا۔ مشاعرے میں موقع محل سمجھ کر داد دینا۔ یہ بھی روایت ہے کہ جونیر طالب علم سینیر طالب علم کی عزت کرتا ہے اور سینیر طالب علم ان کا لحاظ کرتا ہے۔ اور اس کے سامنے کوئی نازیبا بات نہیں کرتا۔ علی گڑھ کی یہ روایت رہی ہے کہ چھٹیوں کے آغاز میں جب گرلز کالج کی لڑکیاں بھی سفر کرتی ہیں اور اپنے گھروں کو جاتی ہیں تو طالب علم حسب ضرورت ان کی مدد کرتے اور ان کا خیال رکھتے ہیں کہ ناشدنی بات نہ ہونے پائے۔ اس میں ہندو مسلمان کا کبھی کوئی فرق نہیں رہا ہے۔ علی گڑھ کے طالب علموں کی یہ روایت رہی ہے کہ استادوں کی عزت اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ علی گڑھ کی روایت یہ رہی ہے کہ یہاں ہندو اور مسلمان طالب علم مل جل کر رہتے ہیں۔ اور ساتھ پڑھتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو بین اقوامی برادری کا درس دینا علی گڑھ کی تہذیبی روایت ہے جس پر علی گڑھ والے بجا طور پر ناز کرتے ہیں۔

میں نے مارشیس میں علی گڑھ کے پڑھے ہوئے طالب علموں کو اس سرزمین کے لیے آنسو بہاتے دیکھا ہے۔

اگر آپ یہ تمام باتیں دیکھنا چاہیں تو شمشاد میں ذراسی دیر کے لیے آجایئے۔ یہاں آپ کو ہوٹلوں میں لڑکے چائے پیتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اور جب بل کی ادائگی ہوگی تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ کام صرف سینیر کرتا ہے۔ یہاں شمشاد میں آپ کو استاد اور طالب علم نظر آئیں گے۔ اور آپ اگر دیکھیں گے کہ استاد کے ساتھ اس کا شاگرد چل رہا ہے اتفاق سے اس کے ہاتھ میں سگریٹ ہے تو وہ بائیں ہاتھ میں پیچھے کی طرف سگریٹ لے لے گا۔ اور کبھی کبھی آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ اس روایت کی پاسداری میں اس کی انگلی بھی جل گئی۔

اس شمشاد میں آپ کو سائیکل سے طالب علم گزرتے ہوئے کبھی بار بار اترتے چڑھتے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ عمل ایک اجنبی کو حیرت میں ڈال دے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے استاد کو آتا دیکھ کر سائیکل سے اتر کر سلام کر کے تب آگے بڑھیں گے۔

یہ اور ایسی کتنی باتیں ہیں جو ہماری علی گڑھ تہذیب کا ایک ضروری حصّہ بن گئی ہیں۔ اور ہم ان روایات پر ناز کرتے ہیں۔ اور میں اسی لیے کہتا ہوں کہ علی گڑھ کا طالب علم کوئی بھی جامہ پہن لے وہ اپنے انداز قدر سے پہچانا جاتا ہے۔ چاہے وہ شمشاد میں کھڑا ہو یا کناٹ پلیس اور چوپاٹی پر ـــ اسی لیے وہ علیگ کہلاتا ہے۔

آیئے ذراسی دیر کے لیے پھر شمشاد میں آکر کھڑے ہو جایئے۔ یہاں آپ کو یونیورسٹی کے ان تمام استادوں کا کچا چٹھا معلوم ہو جائے گا جن کے یہاں ملازم کام کرتے ہیں۔

یہ جگہ ہے مولانا عشرت کی دکان کے پیچھے گوشت، والوں کی دکانیں۔

یہاں بڑا گوشت ملتا ہے۔ یہ ملازم زیادہ تر ان ہی دکانوں سے گوشت خریدتے ہیں۔ جو مالک بڑا گوشت یعنی بھینسے کا گوشت کھانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ان کے ملازم بھی گوشت یہیں سے خریدتے ہیں۔ بس وہ یہ کرتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کٹوا لیتے ہیں۔ اور بڑے نہیں رکھتے چنانچہ یہ حضرات اپنے ہم چشموں میں بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ بھئی ہم تو بکرے کا گوشت کھاتے ہیں۔ حالانکہ جہاں بڑا گوشت تین روپے کلو ملتا ہے وہاں بکرے کا گوشت نو روپے کلو۔ ظاہر ہے کہ نو روپے کلو گوشت ہی ریاست کی پہچان ہوسکتی ہے۔

ہاں تو گوشت والوں کی دکانیں گھریلو ملازموں کا ایک قسم کا کلب ہے۔ صبح ہوئی اور یہ کلب شروع ہوا۔ ناشتہ تیار کرکے ہر ایک ملازم گوشت خریدنے یہاں آجاتا ہے۔ ویسے تو وہ اگر چاہے تو آدھے گھنٹے میں گوشت خرید کر فارغ ہوسکتا ہے۔ لیکن شمشاد آکر آدھے گھنٹے میں فارغ ہوجائے، یہ اس کے لیے مناسب نہیں۔ کیونکہ آدھے گھنٹے میں شمشاد کی خبریں اکٹھا کرنا بھی اس کے بس میں نہیں۔ اور یہ کام بھی وہ اپنے فرائض میں سمجھتا ہے۔ نیز یہ بھی شمشاد کے شایانِ شان نہیں کہ یہاں کوئی کام اتنی جلدی ہوجائے۔

شمشاد یہیں آکر وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے اور جب یہاں سے جاتا ہے تو فارغ ہوکر ہلکا۔ اپنے آقا کے خلاف اس کے دل میں جو غبار ہوتا ہے وہ سب نکال دیتا ہے۔ البتہ آقا کے معاملے میں بھی میں ذرا وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ ان گھریلو ملازموں کو مرد آقاؤں سے شکایت نہیں ہوتی جنھیں یہ عام طور پہ صاحب یا ڈاکٹر کہتے ہیں۔ انھیں شکایت ہوتی ہے بیگم صاحبہ سے۔ جو صبح سے شام تک ناک میں دم کیے رہتی ہیں۔

یہ ملازم اس بات کے اظہار کے لیے ایک فقرہ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن میرے پاس راہی معصوم رضا کا قلم نہیں ورنہ وہی لکھ دیتا۔

ان ملازموں کو یہ بھی شکایت ہے کہ بیگم صاحبہ انھیں ایک لمحہ خالی بیٹھا نہیں دیکھ سکتیں۔ جہاں انھوں نے دیکھا کہ ملازم کے پاس کوئی کام نہیں ہے انھوں نے فوراً اسے کتے کی دم سیدھی کرنے پر لگا دیا۔ ایسا کام جو کبھی پورا نہیں ہوتا۔

پھر ایک بات اور ہے بیگم صاحبہ کا بس چلے تو ان ملازموں سے بازار کا کوئی کام نہ لیں۔ اگر مجبوراً کسی چیز کی اچانک ضرورت پڑ جاتی ہے اور خریدنے کے لیے شمشاد بھیجتی ہیں تو پہلے اس سے چیز کا بھاؤ معلوم کیے رہتی ہیں حالانکہ انھیں یہ نہیں معلوم کہ بازار کے بھاؤ "روز بدلا" رہتے ہیں۔ لیکن انھیں اس سے کیا مطلب۔ جس وقت حساب لیں گی تو پائی پائی کا لیں گی۔ کبھی جو ایک پیسہ بھی چھوڑ دیں۔ صاحب البتہ شریف آدمی ہیں۔ جب بات کرتے ہیں تو کچھ ایسے "ارے یار! اپنے ہاتھ کی ایک پیالی چائے تو پلا دو" اور اس وقت بیگم صاحبہ کے تیور چڑھ جاتے ہیں۔ جل بھن کر کوئلہ ہو جاتی ہیں۔ تم نے ہی اس کا دماغ خراب کیا ہے ورنہ پہلے کتنا اچھا تھا۔ اور پھر خود کہیں گی "ارے نورا کے بچے یہاں کھڑا کیا تک رہا ہے۔ یہاں سے ہٹ جلس — اور جلدی جلدی کام کر — تیرے تو ہاتھ پاؤں ہلتے ہی نہیں"۔

یہ بیگم صاحبہ کے بات کرنے کا انداز — صاحب سگریٹ منگائیں گے تو کبھی دام نہ پوچھیں گے۔ جو پیسے دے دیے دے دیے، کبھی گنے بھی نہیں اور کبھی کبھی تو واپس بھی نہیں مانگے۔

گوشت کی دکان کا موضوع سخن ایسا ہی ہوتا ہے۔ علی گڑھ کا ملازم بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔ وہ جب ملازمت کے لیے کسی کے یہاں جاتا ہے تو پہلے مالک کا انٹرویو لیتا ہے۔ کام کے بارے میں زیادہ

گفتگو نہیں کرتا۔ کام کے بارے میں تو اس کا خیال ہے کہ وہ گھر کا سارا کام سنبھال لے گا۔ وہ اصل بات تنخواہ اور اپنے کھانے کپڑے کے بارے میں پوچھے گا کیونکہ وہ ایک وقت گوشت کھانے اور سنیما دیکھنے کا عادی ہوتا ہے اور سنیما صاف کپڑے پہن کر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے مالک کی پوری خدمت کرنا چاہتا ہے کیونکہ بقول بیگم صاحب کے۔ نوکر کے بچے آتے ہی یہ سوال کریں گے "صاحب بازار کا سارا سودا سلف میں لاؤں گا۔ اوپر کے ایسے کام میں آپ اور بیگم صاحبہ کو کوئی دخل نہ ہوگا۔ مہینے کا سامان میں لاؤں گا اور روز مرّہ کا سامان بھی۔"

اگر آپ یہ کہیں گے کہ مہینے کا سامان آپ خود لائیں گے تو وہ کام کرنے سے انکار کر دے گا۔ اور کہے گا "سرکار! اگر خرید و فروخت کا کام آپ خود کریں گے تو پھر نوکر رکھنے کی کیا ضرورت ہے دو روٹی توے پر ڈالنا اور ایک ہانڈی پکانا کون سا محنت کا کام ہے۔"

اگر آپ پھر ڈھٹائی سے کہیں گے کہ بھائی ہمارا سودا بنیے کے یہاں سے ملے ہے۔ میں خود لے آؤں گا۔ ویسے ابھی مہینے میں ایک بار تو یوں بھی مجھے بازار جانا پڑتا ہے۔ پھر وہ صفائی سے کہہ دے گا "سرکار! اگر یہ بات ہے تو پھر اتنی تنخواہ میں ہمارا گزارا نہیں ہو سکتا۔ آخر ہمارے بھی تو بال بچے ہیں۔"

اور وہ بغیر سلام کیے چلا جائے گا۔ علی گڑھ میں کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ قانون توڑنا، رشوت لینا، کم تولنا، دودھ میں پانی ملانا، کھانے کی چیزوں میں ملاوٹ کرنا ـــ ان تمام باتوں کو قانونی حیثیت حاصل ہے۔ علی گڑھ دودھ کا مرکز ہے۔ شاید ہی ہندستان کے کسی ضلع میں اتنا دودھ پیدا ہوتا ہو۔ اسی لیے وہاں یوپی گورنمنٹ کا سینٹرل ڈیری فارم بھی ہے۔ اور گلیکسو کمپنی کا کارخانہ بھی۔ جہاں بچوں کے لیے بڑی

صفائی سے دودھ تیار رہتا ہے۔ لیکن علی گڑھ میں آپ کو خالص دودھ نہیں ملے گا۔ آپ اس پر اصرار بھی نہ کیجیے گا۔ ورنہ ڈانٹ کھا جائیں گے۔ دودھ والا بڑی دیدہ دلیری سے دودھ میں پانی ملانے کا اعتراف کرتا ہے۔ البتہ اگر شریف ہوا تو یہ کہہ دے گا کہ "کل سے کم پانی ملاؤں گا۔"

یہ پانی بیچنا دودھ والوں کی خوشحالی کا اور شہر والوں کی صحت کی خرابی کا راز ہے۔ کیونکہ دودھ میں صرف پانی ہی ملایا نہیں جاتا بلکہ نہ جانے کیا کیا چیزیں ملائی جاتی ہیں۔

ملازم کا ذکر آیا تو مجھے ہمیشہ انجمن ترقی اردو ہند کے نائب معتمد محمد حفیظ الدین صاحب کے ملازم کا خیال آتا ہے۔ شاید یہ اپنی نوعیت کا ہندستان میں پہلا ملازم ہو۔ وہ جب کسی کے یہاں ملازمت کرتا تھا تو اس کا گھر بار دیکھ لیا کرتا تھا۔ اور اس کی حیثیت آمدنی اور ذمہ داری کے مطابق اپنی تنخواہ خود مقرر کرتا تھا! اگر آپ اس سے یہ کہیں کہ خاں صاحب! میں آپ کو پچاس روپے ماہانہ دوں گا تو خاں صاحب کا جواب ہوگا: "اس مہنگائی میں اگر آپ نے مجھے پچاس روپے دیے تو آپ اپنا خرچ کیسے چلائیں گے۔ میں تو پچیس روپے سے زیادہ نہ لوں گا!"

اس جواب سے آپ بہت خوش ہوں گے۔ اور اس خوشی میں آپ اسے فوراً رکھ لیں گے۔ لیکن وہ آپ کے لیے عذاب ہو جائے گا۔ آپ کے لیے اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ اب یہی دیکھیے میرے کرم فرما مولوی حفیظ الدین صاحب کا کیا حال ہوا۔

ایک روز حفیظ صاحب کے ایک دوست مکتبہ جامعہ کے ذوالفقار صاحب چند روز کے لیے علی گڑھ آئے خاں صاحب نے معمول کے مطابق ناشتہ سے لے کر کھانے تک کوئی تبدیلی نہیں کی حفیظ صاحب نے ناراض ہو کر کہا "یہ کیا تماشہ ہے دہی ایک مکھن کی ٹکیہ

اور وہی ایک انڈا اور ایک کھانا۔"

خاں صاحب کو نصیحت کا موقع ملا کہنے لگے: "حضور مہمان نوازی کا تو بڑا شوق ہے لیکن مہمان کی خاطر آدھا پیٹ کھائیں یہ آپ کو گوارہ نہیں اب مہمان رہے یا چلا جائے اسی میں گزر کرنا ہوگا۔"

حفیظ صاحب خاں صاحب کے سامنے بے بس تھے چنانچہ پہلا کام یہی کرتے تھے کہ آنے والے مہمان کا مکمل طور پر تعارف کراتے تھے تاکہ اس کو شکایت نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس کے کھانے کا ان کو علاحدہ سے بھی کچھ انتظام کرنا پڑتا تھا۔ ایک دو مہمان میں یوں ہی زیادہ فرق نہ پڑتا تھا کیونکہ جہاں وہ حفیظ صاحب سے قربانی کرواتے تھے وہاں خود بھی قربانی کرتے تھے۔ حفیظ صاحب حیدر آباد میں شہزادے کے اتالیق رہ چکے تھے وہ ریاستی ٹھاٹ باٹ کے عادی تھے اس لیے اپنے نوکر کے آرام کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ پھل اور میٹھے میں اس کا حصہ ضرور ہو چنانچہ جب مہمان آجاتا تو دو آدمی کے حساب میں تین آدمی کھاتے جو کمی پڑتی اس کا انتظام حفیظ صاحب خود کرتے جس زمانے میں مہمان ہوتا اس زمانہ میں خاں صاحب خود پھلوں کا استعمال ترک کر دیتے۔

مجھ سے خاں صاحب بہت خوش تھے اور اس خوشی کا سبب بعد میں معلوم ہوا میرا ملازم بہرہ تھا اور بہرے پن کی وجہ سے اس سے عقل کے معاملے میں بھی غلطی ہوئی کہ جب عقل کے بٹنے کا اعلان ہوا تو اس نے سنا نہیں چنانچہ وہ محروم رہ گیا۔ ایک روز شمشاد میں مولانا عشرت کے یہاں چوری ہوگئی کسی نے مذاق میں میرے نوکر کا نام لے دیا پولیس والے پکڑ کر لے گئے مجھے جب معلوم ہوا تو فکر ہوئی کہ کہیں اس کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے کیونکہ موصوف پر ہر وردی پہننے

والے سے ڈرتے تھے ۔ چنانچہ میں تھانے گیا اور سب انسپکٹر سے کہہ ان کو چھڑوا لایا۔

یہ اطلاع خاں صاحب کو بھی مل گئی چنانچہ ایک روز حفیظ صاحب کو کھانا کھلا رہے تھے کہ بولے " میاں آپ نے کچھ سنا پرویز صاحب کے ملازم کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی وہ خود تھانے گئے اور تھانے دار سے وہ گٹ پٹ کی کہ اسے چھوڑنا پڑا اور اس نے معافی مانگ لی۔ حفیظ صاحب نے مذاقاً کہا " پرویز صاحب بلا وجہ ایک ملازم کے لیے تھانے گئے میرا نوکر پکڑا جائے تو میں تو ہرگز نہ جاؤں "

یہ جملہ سننا تھا کہ خاں صاحب کے تیور بدل گئے ۔ تین منٹ میں اس ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور کہنے لگے " حضور! اگر آپ آقا ہو کر ملازم کا خیال نہ کریں گے تو مجھے ملازمت کی کیا ضرورت ہے "

حفیظ صاحب نے بہت سمجھایا مگر نہ مانے ۔ لیکن ان کے گھر برابر آتے رہے ۔ ان کے نئے نوکر کی نگرانی کرتے رہے ۔ اس کو ضروری ہدایت دیتے تھے کہ وہ حفیظ صاحب کا خیال رکھے ۔ لیکن ملازمت کے لیے تیار نہ ہوتے تھے ۔

ایک روز میرا ملازم الہ آباد چلا گیا ۔ میں سخت پریشانی میں تھا حفیظ صاحب سے ذکر آیا ۔ انھوں نے کہا " خاں صاحب کو بھیج دوں گا ۔ آپ فکر نہ کریں "

چنانچہ انھوں نے خاں صاحب سے ذکر کیا ۔ میری پریشانی اور نوکر کا چلا جانا ۔ خاں صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ کہنے لگے " اگر پرویز صاحب نے مجھ سے پہلے کہہ دیا ہوتا تو میں ہرگز اس کو جانے نہ دیتا "

حفیظ صاحب نے کہا " تم کیوں نہیں کام کر لیتے "

کہنے لگے " حضور وہ بڑے فضول خرچ ہیں ۔ ان کے یہاں دن بھر مہمان آتے رہتے ہیں مجھ سے ان کا خرچ نہ دیکھا جائے گا "

لیکن حفیظ صاحب نے کسی نہ کسی طرح انھیں میرے گھر بھیج دیا۔ اتفاق دیکھیے کہ اس روز میرے دوست ڈاکٹر اشفاق محمد خاں کی بیگم صاحبہ ان کی خوشدامن اور برادر نسبتی یہاں آئے ہوئے تھے۔ سب لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ خاں صاحب سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔ اور حفیظ صاحب سے کہنے لگے "میں کام سے نہیں گھبراتا لیکن اتنی فضول خرچی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔"

مولوی محمد حفیظ الدین صاحب انجمن ترقی اردو میں تھے۔ ان کی تنخواہ اپنی آخری سرحد کو چھو چکی تھی۔ اس لیے جب تک گریڈ میں تبدیلی ہو اس میں کچھ اضافہ نہ ہو سکتا تھا۔ یہ بات خاں صاحب کے علم میں تھی۔ اس لیے جب حفیظ صاحب چاہتے تھے کہ خاں صاحب کی تنخواہ بڑھا دیں تو وہ کبھی تیار نہ ہوتے اور یہی کہا کرتے تھے کہ "آپ کی تنخواہ کون سی بڑھ رہی ہے جو ہماری تنخواہ بڑھا رہے ہیں۔"

شمشاد میں وہ ہمیشہ حفیظ صاحب کی تعریف کرتے نظر آتے تھے جہاں کسی سے بھی سرگرم گفتگو ہوں، یہی سمجھیے کہ حفیظ صاحب ہی موضوع سخن ہوں گے میرے پاس وہ حفیظ صاحب کی تعریف کرنے کے لیے آتے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتے تھے کہ "اگر پولیس مجھے پکڑ لے جائے تو حفیظ صاحب ہرگز نہ چھڑائیں۔ اس لیے ایسی ملازمت سے کیا فائدہ ـــــ لیکن پرویز صاحب! حفیظ صاحب کا کیا کہنا ـــــ میں نے طے کر لیا ہے کہ چاہے مارا مارا پھروں لیکن ملازمت کسی کی نہ کروں گا۔ حفیظ صاحب کی ملازمت کی اور بات تھی۔"

سرور صاحب سے اس لیے ناراض تھے کہ انجمن کے نائب معتمد کی تنخواہ نہیں بڑھاتے، جو اتنا کام کرتے ہیں۔ خاں صاحب یہ بات پسند نہ کرتے تھے کہ گھر میں دفتر کا کام کیا جاتے۔ کیونکہ حفیظ صاحب

کی تنخواہ وہی تھی پھر وہ کام زیادہ کیوں کریں؟

خاں صاحب کو جو تنخواہ ملتی اسے وہ ایک وکیل کے پاس جمع کر دیتے جس کے بارے میں کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ یہ عمل برسوں سے جاری تھا کبھی ایک پیسہ واپس نہ لیتے اگر کوئی کہتا کہ وکیل صاحب کے پاس کیوں جمع کرتے ہیں تو ناراض ہو جاتے اور یہی کہتے —

"میاں آپ کیا جانیں — وہ سید ہیں — کبھی بے ایمانی نہیں کریں گے۔"

اللہ اللہ کیا اعتماد تھا۔

بعد میں رہی سہی عقل نے بھی جواب دے دیا۔ شمشاد میں مارے مارے پھرتے تھے اور بال کٹوانے کے پیار آنے مانگا کرتے تھے اور اس طرح جو کچھ ملتا اسے بھی سید وکیل کے پاس جا کر جمع کر دیتے۔ میرا بڑا جی چاہتا ان وکیل صاحب سے ملنے کا لیکن خاں صاحب ان کا نام بتانے کو تیار نہ تھے۔ بہت دنوں سے مجھے شمشاد میں وہ نظر نہیں آئے۔ اللہ جانے کیا بات ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو میں بڑے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ خاں صاحب جیسے لوگ اب آئندہ تو پیدا نہیں ہوں گے۔

خاں صاحب سے شمشاد میں اچھی خاصی رونق تھی۔ میں نے ان کو بارہا شمشاد میں رنگ بھرتے دیکھا ہے۔

شمشاد کی کہانی کچھ ایسی ہے کہ اگر میں اسی طرح لکھتا رہوں تو کبھی ختم نہ ہو گی۔ لیکن موٹے سید صاحب کے بغیر یہ کہانی بے جان ہو گی۔ یوں تو شمشاد میں حبیب صاحب کو بھی سید صاحب کہتے ہیں اور میرے پڑوسی بھی سید ہیں جنھیں لوگ سید صاحب کہتے ہیں لیکن انھوں نے ریٹائر ہونے کے بعد علی گڑھ چھوڑ دیا ہے۔ میاں بیوی بدایوں چلے گئے ہیں۔ شمشاد میں سناٹا ہو گیا۔ کبھی کبھار شمشاد سے ملنے اور اپنے لڑکے کو دیکھنے چلے آتے

ہیں۔ مستقل طور پر اپنی کاشتکاری کرتے ہیں۔

چنانچہ اب بازار میں سید حبیب رہ گئے ہیں اور موٹے سید۔ غالباً پہچاننے کے لیے ہوگا۔ انھیں پیٹھ پیچھے موٹے سید اور سامنے چچا سید کہتے ہیں۔ سید صاحب جب بازار میں چلتے ہیں، تو ایسا لگتا ہے کہ بازار بھرا ہوا ہے۔ وہ ہاتھ میں چھڑی لیے ہوئے قدم جما جما کر چلتے ہیں۔ آپ نے خواہ انھیں کبھی نہ دیکھا ہو لیکن شمشاد مارکیٹ میں اگر کسی کو اس طرح چلتا دیکھو اور آپ کی نظر معاً زمین کے اس حصے پر پڑے جس پر سید صاحب کے قدم پڑ رہے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ یہی ہمارے سید درانی ہیں۔

سید صاحب اللہ یار خاں کے دفتر کے پیچھے رہتے ہیں۔ وہ شام کو ٹہلنے نکلتے ہیں اور جیسے ہی وہ ٹہلنے نکلتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ بازار میں رونق آگئی، چراغ جل گئے۔ سید صاحب کہیں دور ٹہلنے نہیں جاتے وہ شمشاد کے آس پاس ٹہلتے ہیں۔ میری ان سے تفصیلی ملاقات تو خیر دور کی بات۔ کبھی کسی جگہ مجھے ان سے پانچ منٹ بھی بیٹھ کر باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن بیس سال سے ان کو برابر دیکھ رہا ہوں۔ جب میں علی گڑھ سے دور ہوتا ہوں تب بھی وہ مجھے نظر آتے ہیں کیونکہ وہ شمشاد کا لازمی حصہ ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ شمشاد سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔

پہلے سید صاحب میونسپلٹی کے کسی اچھے عہدے پر تھے اور میں نے تقریباً بیس سال پہلے ان کو اس دفتر کی سب سے معزز کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ پھر سنا کہ سید صاحب نے ملازمت چھوڑ دی۔ ان کا میونسپلٹی سے کوئی مقدمہ چل رہا ہے۔ لیکن مجھے ایسی افواہوں پر کبھی یقین نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کرسی، سید صاحب کے لیے چھوٹی ہوگئی اور دفتر میں اس سے بڑی کرسی کا انتظام نہ ہو سکا۔ چنانچہ سید صاحب نے دفتر جانا چھوڑ دیا۔ اب سنا ہے کہ ایک کمرے میں اکیلے رہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔

اگر میرٹھ میں ان کے کوئی رشتہ دار ہیں تو ان کا رشتہ صرف خون اور رسمی رشتے سے ہے۔ شمشاد سے ان کا تعلق زندگی اور موت کا ہے۔ موت! اس لیے کہ اب سے تقریباً دس بارہ سال پہلے سید صاحب کسی مقدمے کے سلسلے میں الٰہ آباد گئے ہوئے تھے۔ وہاں فساد ہو گیا۔ الجمعیۃ میں خبر آئی کہ کسی فسادی نے ان کے پیٹ میں چھرا بھونک دیا۔ اور سید صاحب جاں بحق تسلیم ہو گئے۔ بہتوں کو یقین نہ آیا کہ سید صاحب کے کوئی چھرا بھونک سکتا ہے۔ اور کیا ایسا چھرا بن چکا ہے جو سید صاحب کے پیٹ تک پہنچ جائے۔ لیکن پھر کسی نے اس پر بحث نہیں کی اور شمشاد میں سناٹا چھا گیا یہ جمعہ کا مبارک دن تھا۔ شمشاد کی مسجد میں ایک غائبانہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ یہ شام شمشاد کی اداس شام تھی، دکانیں بند تھیں۔ کئی بار ایسا محسوس ہوا جیسے شمشاد کی دھڑکن اک دم رک گئی لیکن اگلے دن شمشاد کی زندگی پھر واپس آ گئی۔ بازار میں پھر وہی رونق، پھر وہی شور۔ البتہ کہیں کہیں لوگ کچھ سرگوشیاں کرتے اور رومال سے آنکھیں پونچھتے نظر آتے۔ غالباً سید صاحب کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں گے، اور ان کی یاد میں آنسو بہا رہے ہوں گے لیکن ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ اچانک سید صاحب چلے آ رہے ہیں۔ لوگ اپنی آنکھوں کو بار بار مل رہے تھے جیسے کوئی خواب دیکھ رہے ہوں۔ لیکن یہ حقیقت تھی خواب نہ تھا۔ سید صاحب زندہ تھے شمشاد کے دل کی دھڑکن ایک دن کے لیے بھی نہ رکی تھی۔

وہ دن اور آج کا دن ـــــ سید صاحب اور شمشاد ایک دن کے لیے بھی جدا نہیں ہوئے بزرگوں کا کہنا ہے کہ اگر موت کی خبر غلط اڑ جائے تو آدمی کی زندگی بڑھ جاتی ہے۔ میں ضعیف الاعتقاد نہیں، لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ سید صاحب ہمیشہ زندہ رہیں ابد الآباد تک۔

فراق صاحب کے بارے میں ایسی خبریں ایک سے زیادہ بار اڑیں۔

مختلف شہروں میں تعزیتی جلسے ہوئے لیکن فراق صاحب اسی انداز سے شعر کہہ رہے ہیں اور پہلے سے بھی بہتر اور اسی سال کا بوجھ ان کے کندھوں پر ذرا سا بھی نہیں ہوتا۔

چچا سید کو شمع معمے بھرنے یا بھروانے کا شوق ہے۔ یہی ان کا بہترین مشغلہ ہے اس کے پیچھے مجھے یقین ہے کہ کوئی لالچ کا جذبہ نہیں ہے۔ صرف اپنے آپ کو مصروف رکھتے ہیں۔ بہرحال جب امین اشرف صاحب کو ان کے ساتھ چلتے دیکھتا ہوں ـــــ بڑی نیازمندی کے ساتھ چچا کہتے تو مجھے یہی خیال ہوتا ہے کہ امین اشرف اپنے دل میں یہی سوچ رہے ہوں گے کہ شاید معمے کا کوئی لفظ ان کی زبان سے نکل جائے اور ان کا نام شمع کے خوش نصیبوں میں آجائے۔

جس روز شمشاد میں بھیڑ کم ہوتی ہے شور و شر نہیں ہوتا تو چچا سید بازار میں جلدی جلدی ٹہلتے اور لوگوں کو سلام کرتے اور دعائیں دیتے ہیں۔ سچ ہے کہ ذوق نغمے کی کمی ہو تو نوا کو تیز کر دینا چاہیے، اور شاید سید صاحب اسی لیے ایسا کرتے ہیں۔

سید صاحب معمے بھریں یا نہ بھریں۔ کسی کو مشورہ دیں یا نہ دیں لیکن وہ اپنی چھڑی کے ساتھ شمشاد میں اسی طرح ٹہلتے رہیں، یہی میری آرزو ہے۔

اس سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شمشاد محض چند افراد کا اور ان سے متعلق دکانوں کا نام ہے۔ یہ نام ہے ایک ماحول کا ـــــ ایک حمام کا ـــــ ایک ادارے کا ـــــ ایک مخصوص فضا کا۔ جس میں صرف جبار صاحب، حبیب صاحب، چچا سید اور اسد یار خاں ہی نہیں رہتے۔ ان فرزانوں کے علاوہ یہاں دیوانے بھی رہتے ہیں۔ یہاں ایک زمانہ تھا چھمو کا۔

چھمو نان بائی کی دکان میں کام کرنے والے بوڑھے کی دیوانی لڑکی تھی۔ لیکن چھمو اسی کی لڑکی نہیں، سارے بازار کی بیٹی تھی، یونیورسٹی کے ہر لڑکے کی بہن تھی۔ شمشاد کا ہر فرد اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ سارے بازار میں

ماری ماری پھرتی تھی۔ اس کی دیوانگی کا اثر کسی پر نہ پڑتا تھا۔ یہ دیوانگی تو صرف چھمو کی دشمن تھی۔ ایک جوان لڑکی بازار میں یوں مارے مارے پھرنا، کسی اجنبی کو عجیب سا لگ سکتا ہو اور شاید لگتا ہو۔ شمشاد سے وہ اتنا ہی مانوس تھی جتنی حبیب صاحب کی آواز یا لالہ کی دکان۔ سب لوگ اس پر ترس کھاتے اور اس سے پیار کرتے تھے وہ شمشاد میں کسی بھی ہوٹل میں جا سکتی تھی۔ اسے کھانے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ شمشاد میں اسی طرح رہتی جیسے لڑکیاں اپنے گھروں کے آنگن میں گھومتی ہیں۔

غرض شمشاد کے اس ماحول میں تمام آنکھیں تھیں جو اسے باپ اور بھائی کی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ وہ اپنی دیوانگی میں شمشاد کی آبرو کی طرح رہتی تھی۔

لیکن ایک دن کیا ہوا ایک ٹرک تیزی سے آئی اور اسے کچلتی ہوئی چلی گئی۔ چھمو مر گئی۔ شمشاد میں سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص اداس تھا۔ ذرا سی دیر میں یونیورسٹی کے لڑکوں کو بھی معلوم ہو گیا کہ شمشاد کی چھمو مر گئی۔ اس روز لڑکے ہوٹلوں میں چائے پی رہے تھے لیکن اداس تھے۔ لتا منگیشکر اور کشور کمار کے گانوں کی آواز آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی۔ ایک خوفناک سناٹا چھا گیا ایک بیٹی اور ایک بہن مر گئی تھی۔ شمشاد کا ماتم ایسے ہی ہوتا ہے۔ شمشاد ہر موت کے بعد مرتا اور اگلے دن پھر جی اٹھتا ہے۔ آپ نے اس ضدی کھلونے کے بورے کو دیکھا ہوگا جس پر اگر آپ ہاتھ ماریں تو وہ گر پڑے گا لیکن پھر دوسرے لمحے پہلے کی طرح اپنی جگہ پر بیٹھ جائے گا۔ میں نے بارہا شمشاد کو اسی طرح گرتے اور اٹھ جاتے دیکھا ہے اس کا عمل جاری ہے اور جاری رہے گا۔ یہاں ہر بار ایک چھمو مرتی ہے اور دوسری چھمو جی اٹھتی ہے۔ یہی شمشاد کی موت اور یہی اس کی زندگی ہے۔

مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست کل اور آج

ترتیب : مشیرالحق

صفحات : 36

قیمت : -/36 روپے

اسلام دورِ حاضر میں (منتخب مضامین)
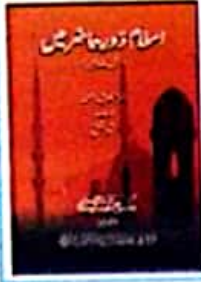
ترتیب : مشیرالحق

صفحات : 208

قیمت : -/75 روپے

انتخاب مضامین سرسید

مصنف : انور صدیقی

صفحات : 140

قیمت : -/52 روپے

انتخابِ نظیر اکبر آبادی

مصنف : رشید حسن خاں

صفحات : 280

قیمت : -/77 روپے

انتخابِ ذوق

مصنف : تنویر احمد علوی

صفحات : 176

قیمت : -/58 روپے

منجملہ
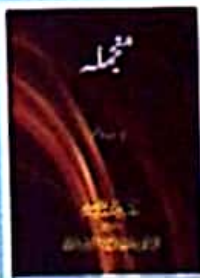
مصنف : یوسف ناظم

صفحات : 96

قیمت : -/50 روپے

انشائیات

مصنف : سید عابد حسین

صفحات : 240

قیمت : -/84 روپے

انشائے غالب
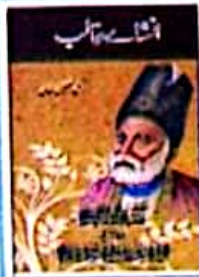
مرتبہ : رشید حسن خاں

صفحات : 148

قیمت : -/62 روپے

ISBN : 978-81-7587-789-4

₹ 99/-